نومبر
۲۰۱۱ء

اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۲۵، شمارہ ۱۱ نومبر ۲۰۱۱ء/ ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ

مشمولات

آدھا سچ	مدیر	۲
O تعلیم و تربیت		
مغربی تعلیم کا زہر	مولانا ابوالحسن ندوی	۳
پاکستان میں تعلیم کی بربادی	اویس قریشی	۸
O میڈیا		
صحافت یا بکاؤ مال	ڈاکٹر محمد امین	۱۰
O ہمارا دینی تناظر		
اتحاد بین العلماء کے لیے سعی محمود	مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی	۱۳
علماء کرام خبردار رہیں	مدیر	۱۶
O پاکستانیات		
کیا جمہوریت کے ذریعے اسلامی انقلاب ممکن ہے؟	ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری	۱۸
پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں ناکامی کے اسباب ـــ کامیابی کا لائحہ عمل	ڈاکٹر محمد امین	۲۲
O تزکیۂ نفس		
عبادت، اطاعت سے اہم تر ہے	احمد جاوید	۳۸
O اسلام اور مغرب		
ٹیکنالوجی اور ٹیکنو سائنس جدید سائنس اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق	سید خالد جامعی	۴۰
مسلم سائنس ـــ اسلامی تعلیمات کا منطقی نتیجہ	راشد شاذ	۵۶
O مدیر کے نام		
پاکستان میں نفاذ شریعت۔ مستقبل کا لائحہ عمل	مولانا زاہد الراشدی	۶۱

آدھا سچ

جس عہد میں ہم زندہ ہیں اس میں (پورا) حق کہنا دہکتا انگارا ہاتھ میں پکڑنا ہے۔

اگر آپ اپنے ملک کی عسکری پالیسی پر تنقید کریں تو آپ دن دہاڑے اٹھا لیے جائیں گے۔ اگر مجاہدین کے بارے میں لب کشائی کریں تو 'شہادت' آپ کا نصیب ہوسکتی ہے یا پھر 'کالا پانی'۔ مسلک پرستوں پر نقد کریں تو توہین رسالت کے ناکردہ جرم میں ساری عمر جیل میں سڑ سکتے ہیں اور اگر 'اناالحق' کا نعرہ لگائیں تو بھی 'اہل توحید' آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور اگر آپ کسی مافیا اور گینگ کی نقاب کشائی کریں گے تو آپ کے بچے سکول سے غائب ہوسکتے ہیں اور بوری بند نعش بھی سڑک پر پڑی مل سکتی ہے۔

جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنا یا جزوی اور آدھے سچ کو پورا سچ کہہ کر پیش کرنا آج ایک 'ہنر' بن گیا ہے۔ پہلے زمانے میں اسے منافقت، مداہنت اور دوچہرگی کہتے تھے۔ آج یہ ایک پروفیشنل صلاحیت اور خصوصی تکنیکی مہارت سے عبارت ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم اس ہنر سے عاری ہیں لہٰذا ہماری تحریروں میں صرف آدھا سچ ہوتا ہے۔

تعلیم و تربیت

مولانا ابوالحسن ندوی

مغربی تعلیم کا زہر (۲)

اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں، جو مغربی نظام تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل پر پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی بھی نکال کر لائے اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہوگیا۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے مغربی تعلیم اور مغربی فلسفہ کا مطلق اثر قبول نہیں کیا اور ان کا دینی فہم کتاب وسنت اور سلفِ امت کے بالکل مطابق ہے(☆) لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس 'آتشِ نمرود' نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا اور بڑی حد تک ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ:

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم بنارِ او چہ بے پروا نشستم (ارمغان حجاز صفحہ ۷۰)

اس جدید تعلیم اور اس کے اثرات کے متعلق مولانا محمد علی جوہر کی شہادت بھی بڑی وقعت رکھتی ہے، جنہوں نے ایک راسخ العقیدہ دینی ماحول میں تربیت پائی تھی پھر مغربی تعلیم کے بہترین ہندوستانی مرکزوں میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ وہ اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

> ''حکومت برطانیہ مکمل مذہبی غیر جانبداری کی قائل اور علمبردار تھی، اور مذہبی حتیٰ کہ اخلاقی تعلیمات کو بھی بالکلیہ بے دخل کرکے اس نے (اس پالیسی) کو عملی جامہ پہنایا، صرف وہ معلومات، جن کو لڑکے از خود انگریزی اور مشرقی زبانوں کی درسی کتابوں میں پائے جانے والے لٹریچر سے اخذ کرلیں، رہ گئیں''۔

دوسری طرف وہ تعلیمی نظریہ جو حکومت نے ہندوستانی نوجوانوں کے لیے بہم پہنچایا تھا، 'جدید' تھا

☆ اس کا اندازہ ان کے ان خطبات سے ہوسکتا ہے، جو انہوں نے مدراس میں دیے تھے، اور جن کا مجموعہ Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے شائع ہوا ہے، اور جس میں کہیں کہیں حقائق غیبی کی فلسفیانہ تعبیر اور تاویل کا شدید رنگ صاف جھلکتا ہے۔

لیکن اپنی تمام تخریبی صلاحیت کے ساتھ ان کا سارا زور اس طرف تھا کہ طالب علم کے اندر ایک بیجا ہمہ دانی کا احساس پرورش پائے اور صدیوں پرانے توہمات کے ساتھ ساتھ روایت اور حجت وسند کی ساری عظمت کو ختم کر دے۔ اس میں شبہ نہیں کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ یہ تعلیم حقیقت کی تلاش وجستجو کے ایک مخلصانہ جذبہ کو بیدار کرنے کا سبب بنی، لیکن اپنی پہلی یورش میں یہ خاص طور پر تخریبی ہی رہی ہے، اور ختم کیے ہوئے توہمات کے بدلہ میں جو تھوڑا بہت اس نے دیا وہ بذات خود بے بنیاد عقائد اور توہمات پر مبنی تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تھوڑا بہت 'جدید' تھا☆۔

Islam in Modern History کا مصنف W.C. Smith جو اسلامی ممالک میں کام کرنے والے مختلف رجحانات اور وہاں کے مختلف طبقوں سے متعلق تازہ معلومات رکھتا ہے، اسلامی ممالک میں جدید مغربی تعلیم اور اس کے مرکزوں کے گہرے ذہنی اثر کا اعتراف کرتا ہے، وہ ممالک اسلامیہ کی حریت پسند تحریک (Liberalism) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ممالک اسلامیہ میں آزاد خیالی اور حریت پسندی کی جو تحریک چل رہی ہے، اس کا ایک اہم سبب اور عامل (Factor) مغرب کا نفوذ بھی ہے۔ یورپ میں حریت پسندی کی تحریک انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک اپنے نقطۂ عروج پر رہی ہے۔ یہی معاملہ یورپ کے تفوق اور ترقی کا ہے۔ بہت سے مسلمان نوجوانوں نے مغرب کا سفر کیا اور یورپ کی اسپرٹ اور اس کے اقدار سے انہوں نے واقفیت حاصل کی اور ایک حد تک وہ ان کے گرویدہ ہوئے۔ یہ بات ان طلباء پر خصوصیت کے ساتھ صادق آتی ہے جو روز افزوں تعداد کے ساتھ یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم وتربیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ ان کے ذریعہ مغرب کی بہت سی چیزیں دنیائے اسلام میں آئیں اور اس کام میں پیش پیش وہ تعلیمی ادارے تھے جنہوں نے ایک پوری نسل کی تربیت کی اور اس کو مغرب کے جدید طرز کے حوالہ کر دیا۔ مغرب سے آنے والی چیزوں میں سے وہ متعدد نئے خیالات اور کم از کم اتنے ہی زیادہ اہم، نازک اور باریک خام ذہنی اندازے اور نئے میلانات تھے جن کو یہ مختلف تعلیمی اسٹائل پھیلانے کے ذمہ دار ہیں۔ مزید برآں مغرب کے دوسرے قانونی، سیاسی، اجتماعی اور دوسری قسم کے جدید اداروں کا بڑھتا ہوا اثر ونفوذ ان میں سے بعض تو زبردستی مسلط کیے جاتے ہیں اور بعض کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔ بعض مسلمانوں نے اس کا مقابلہ کیا، بعض نے اس کا خیر مقدم کیا، بعض

☆ My life, A Fragment p.23,24

کوایسی تربیت دی گئی یا انہوں نے خود تدریجی طور پر ان کو خوش آمدید کہا انجام کار بہت سے مسلمان ان نظریات اور اداروں کو مسلمہ حقائق سمجھنے لگے۔ اس طرح سے مغربیت کی کاروائی تیزی اور طاقت کے ساتھ جاری رہی''☆

لیکن ان چند مستثنیٰ شخصیتوں (اقبال و محمد علی وغیرہ) کو چھوڑ کر، جن کی 'فطرت ابراہیمی' یا خارجی مؤثرات و واقعات نے ان کے نورِ ایمان اور فہم اسلام کی حفاظت کی یا ان کے اندر مغرب کی تہذیب و فکر کے خلاف کوئی شدید ردعمل پیدا ہوا عام طور پر عرب اور عجمی ممالک کے ذہین مسلم نوجوانوں کو (جو اپنی قوم کا جوہر اور سرمایہ تھے) اس نظام تعلیم کے تیزاب نے اتنا بدل دیا کہ نہ اسلام (اپنی صحیح شکل وصورت میں) ان کے جدید ذہن میں فٹ ہوسکتا ہے، اور نہ وہ عام اسلامی معاشرہ میں فٹ ہوتے ہیں، اور بقول اقبال ؎

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی

مذہب کے ایک پرائیویٹ معاملہ ہونے پر اصرار جس کو سیاست و ریاست میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، دین اسلام کے ساتھ مسیحی کلیسا کا سا معاملہ، مذہب و سیاست کی تفریق کا نظریہ، مذہب کو ترقی، اکتشاف و تحقیق کی راہ میں حارج اور مخل سمجھنے کا خیال، علماء اسلام کو مسیحی کلیسا کے ان نمائندوں کی صف میں کھڑا کرنا جو قرون وسطیٰ میں مطلق العنان اقتدار کے مالک تھے، عورت کو بالکل مرد کے مساوی سمجھ کر اس کو زندگی کے تمام میدانوں میں دوڑنے اور حصہ لینے کا اہل اور مستحق سمجھنا، پردہ کو (خواہ وہ کسی شکل میں ہو) مشرق کے قدیم حرم کے نظام کی یادگار اور مردوں کے صنفی استبداد کا نشان سمجھنا اور اس کے ختم کرنے کو اصلاح و ترقی کا پہلا قدم تصور کرنا، اسلام کے قانون میراث اور ضابطۂ نکاح و طلاق کو قرونِ وسطیٰ کے مسلمان فقیہوں کا اجتہاد اور اس محدود اور ابتدائی معاشرہ کا طبعی نتیجہ سمجھنا جو ساتویں آٹھویں صدی مسیحی میں قائم تھا اور اس میں تبدیلی و ترمیم اور مغربی اصولوں اور معیاروں کے مطابق بنانے کے کام کو وقت کا ایک ضروری فریضہ قرار دینا، سود، شراب، قمار، جنسی تعلقات میں آزادی و بے قیدی کو زیادہ معیوب نہ سمجھ کر نظر انداز کرنا، قوم پرستی، قدیم (ماقبل اسلام) تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کا جذبہ اور لاطینی رسم الخط کی افادیت واہمیت پر یقین ۔۔۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے رجحانات (جو اس جدید تعلیم یافتہ نسل کے نزدیک) حقائق و مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں، اور

My Life, A Fragment p.64 ☆

روشن خیالی اور ترقی پسندی کی علامت ہیں، مغربی نظامِ تعلیم اور (محمد اسد صاحب کے الفاظ میں) اس کے ذہنی وفکری ماحول اور فضا اور اس کے تاریخی ورثہ کا نتیجہ ہیں۔

آپ کو ترکی سے انڈونیشیا تک مسلمان ممالک کے جتنے سربراہ اور رہنما نظر آئیں گے وہ سب اسی مغربی نظامِ تعلیم کی پیداوار ہیں، ان میں سے جن کو براہ راست کسی مغربی ملک یا یورپ کے کسی مشہور تعلیمی مرکز میں پڑھنے اور پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا، انہوں نے اپنے ملک میں رہ کر اس نظامِ تعلیم سے (اس کے مخلص نمائندوں کی نگرانی وسرپرستی میں) پورا فائدہ اٹھایا ان میں سے متعدد اشخاص نے ملٹری کالجوں میں تعلیم پائی جہاں مغربی طرز کی تعلیم وتربیت کا خصوصی انتظام ہوتا ہے۔

اس بناء پر آج عالمِ اسلام میں دو ذہنوں، دو فلسفوں، دو معیاروں اور دو رُخوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اور جو عام طور پر منتج ہوتی ہے، زیادہ طاقتور، مسلح، صاحبِ اختیار و اقتدار گروہ کی کامیابی پر، وہ بالکل قدرتی ہے۔ وہ اگر ہے تو خواہ کتنے تأسف کی بات ہو، تعجب کی بات نہیں، تعجب اس وقت ہوتا ہے جب کشمکش اور تجدد ومغربیت کا یہ رجحان پایا نہ جاتا۔

زہر کا تریاق

اس کا علاج (خواہ کتنا ہی مشکل اور کتنا ہی دیر طلب ہو) اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کو ازسرنو ڈھالا جائے۔ اس کو مسلمان اقوام کے عقائد ومسلمات اور مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے۔ اس کے تمام علوم و مضامین سے مادہ پرستی، خدا بیزاری، اخلاقی و روحانی اقدار سے بغاوت اور جسم پرستی کی روح نکال کر اس میں خداپرستی، خداطلبی، آخرت کوشی، تقویٰ شعاری اور انسانیت کی روح پیدا کی جائے۔ زبان وادب سے لے کر فلسفہ ونفسیات تک اور علومِ عمرانیہ سے لے کر معاشیات و سیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالا جائے۔ مغرب کے ذہنی تسلط کو دور کیا جائے، اس کی معصومیت وامامت کا انکار کیا جائے، اس کے علوم ونظریات کو آزادانہ تنقید اور جرأت مندانہ تشریح (پوسٹ مارٹم) کا موضوع قرار دیا جائے،(☆) مغرب کی سیادت و بالاتری سے عالمِ انسانی کو جو عظیم الشان نقصانات پہنچے ان کی نشان دہی کی جائے غرض مغرب کی آنکھوں میں

☆ ڈاکٹر رفیع الدین صاحبؒ کی فاضلانہ کتاب 'قرآن اور علم جدید' اس کا اچھا نمونہ ہے، محمد اسد صاحب کی Islam at the Cross Roads، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی 'تنقیحات' اور 'پردہ' اور سید قطب کی 'العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام' میں بھی مغربی فکر اور افکار واقدار پر تنقیدی مواد ملتا ہے۔

آنکھیں ڈال کر اس کے علوم وفنون کو پڑھایا جائے اور اس کے علوم وتجارب کو مواد خام (Raw Material) فرض کرکے اپنی ضرورت اور اپنے قدو قامت اور اپنے عقیدہ و معاشرت کے مطابق سامان تیار کیا جائے۔

اس عظیم کام میں خواہ کتنی ہی مشکلات ہوں اور اس میں خواہ کتنی دیر لگے عالمِ اسلام میں تجدد و مغربیت کی اس عالمگیر رَو کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں جو اسلام کے وجودِ ملی اور اس کے اجتماعی ڈھانچہ کو چیلنج کر رہی ہے اور اس کے لیے شدید خطرہ بلکہ موت و حیات کا مسئلہ بن گئی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان عوام کا خلوص، ان کی قربانیاں ان کا جذبہ اور ان کی قوت عمل (جس کے سر ان ملکوں کی آزادی اور سلطنتوں کے قیام کا سہرا ہے) اس روشن خیالی وتجدد کی آگ کا ایندھن بن کر رہ گئی ہے اور یہ سادہ دل، بے زبان، گرم جوش اور مخلص عوام ان قائدین اور حکمرانوں کے ہاتھ میں بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ بن کر رہ گئے ہیں جن کو جس منزل کی طرف چاہا جاتا ہے خاموشی کے ساتھ ہنکایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت کی کامیابی اور استحکام کا راز سول سروس کے طبقہ اور حکام کی مغربی تربیت، سلیقہ مندی اور اطاعت شعاری میں تھا انہوں نے اس ملک کا سانچہ بنایا اور سو برس تک کامیابی کے ساتھ اس ملک کو اس کے غیر ملکی حکمرانوں کے منشا اور مزاج کے مطابق چلاتے رہے، اب بھی اسلامی ممالک کے رُخ کی تبدیلی اور اسلامی فکر اور اسلامی زندگی کی طرف ان کو لے چلنے کی تدبیر یہی ہے کہ اس طبقہ کی اسلامی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے جس کے ہاتھ میں ملک کی رہنمائی اور اس کے زمام کار آنے والی ہے اور اس نظام تعلیم کو درست کیا جائے جو اس طبقہ کو تیار کرتا ہے۔

نظام تعلیم کی یہ بنیادی تبدیلی اور اس کی اسلامی تشکیل اگرچہ نہایت ضروری ہے مگر دیر طلب اور طویل کام ہے، اور اس کے لیے وسیع و عظیم صلاحیتوں اور وسائل کی ضرورت ہے، جدید اسلامی نسل کا معاملہ ایک دن کی تاخیر اور التواء کا روادار نہیں، مندرجہ بالا کام کی تکمیل تک (اور حقیقتاً اس کی موجودگی میں بھی) یہ کام ان اسلامی اقامت خانوں (Muslim Hostels) سے لیا جاسکتا ہے جن میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مسلم طلبہ قیام کریں اور وہاں اسلامی تربیت اسلامی زندگی اور ماحول کے قیام اور صالح ذہنی و روحانی غذا کے مہیا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے (ختم شد)۔

اویس قریشی

پاکستان میں تعلیم کی بربادی

پاکستان میں طبقاتی نظام تعلیم مختلف حکومتوں کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود دم توڑنے کی بجائے وقت کے ساتھ ساتھ مزید پنپ رہا ہے۔ پنجاب سمیت چاروں صوبوں کے سرکاری سکول صرف کلرک پیدا کر رہے ہیں اور چند بڑے پرائیویٹ سیکٹر کے سکول بھاری بھر کم فیسیں لے کر ایک مخصوص ایلیٹ کلاس کو پروموٹ کر رہے ہیں۔ ملک کی دو بڑی جماعتوں نے ہر مرتبہ برسر اقتدار آنے پر ملک میں یکساں پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر میں ایک ہی قومی نصاب کو لازمی قرار دینے کے لیے قانون سازی کے نعرے لگائے مگر بدقسمتی سے 63 برس گزرنے پر بھی پرائیویٹ سکولوں میں ہی طرح طرح کے نصاب پڑھائے جاتے ہیں اور حکومتی کنٹرول نہ ہونے اور وفاقی وصوبائی سطح پر کوئی مؤثر چیک اینڈ بیلنس کی پالیسی عدم دستیابی کے باعث پرائیویٹ سیکٹر میں سکولوں اور ہائر ایجوکیشن جن میں کالجز اور یونیورسٹیاں شامل ہیں جنگل کا قانون نافذ ہے اور شتر بے مہار کی طرح ہر ادارے نے اپنے اپنے سٹیٹس کے حساب سے اپنا نصاب اور اپنی فیس مقرر کر رکھی ہے۔

بڑھتی ہوئی مہنگائی کے باعث 40 فیصد سے زائد متوسط طبقے کے والدین نے اوسط پرائیویٹ سکولوں کی بھی فیسیں ادا نہ کر سکنے کے باعث اپنے بچوں کو سرکاری سکولوں میں داخل کروایا ہوا ہے اور یونیورسٹیاں سالانہ لاکھوں روپے وصول کر رہی ہیں۔ وفاقی وصوبائی حکومت کے متعلقہ ذمہ داران سمیت کوئی نوٹس بھی نہیں لے رہا۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے گھمبیر ہوتی ہوئی تعلیمی صورت حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے:

اہم اعداد وشمار ـــــ ایک نظر میں

پاکستان میں سرکاری سکولوں کی تعداد	1,54,000

لاہور میں پرائیویٹ سکولز	18,000
رجسٹرڈ پرائیویٹ سکولز	6,500
لاہور میں سرکاری سکول	1,020
پنجاب میں سرکاری سکولز	63,000
پنجاب میں پرائیویٹ سکولز	86,000

لاہور میں خصوصی امراء کے سکولوں کی فیس	4,000ڈالر سالانہ
لاہور میں امراء کے سکولوں کی فیس	25,000 - 20,000روپے ماہانہ
اعلیٰ متوسط طبقے کے سکولوں کی فیس	10,000 - 6,500 روپے ماہانہ
پرائیویٹ میڈیکل کالجوں کی فیس	8,00,000 - 5,00,000روپے سالانہ
اوورسیز طالب علموں کی فیس	17,000 - 12,000ڈالر سالانہ

(بشکریہ نوائے وقت)

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400روپے تاحیات 5000روپے خصوصی تعاون 10,000 روپے

نام.. پتہ ....

فون نمبر..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ڈاکٹر محمد امین

صحافت یا بکاؤ مال

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل مغرب (امریکہ و یورپ) اور ان کے حلیفوں (اسرائیل و بھارت وغیرہ) کی اسلام اور مسلم دشمنی مسلمہ ہے اور پاکستان دشمنی بھی اسی کا ایک شاخسانہ ہے کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور (اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود بہر حال) اپنے اسلامی تشخص سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں اور ہم محض 'سازش تھیوری'☆ کے طعنے سے بچنے کی خاطر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اہل مغرب اور ان کے حلیف اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کی خاطر ہر قسم کی سازشوں میں مصروف رہتے ہیں جن میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ رشوت دے کر ہمارے اندر پھوٹ ڈالتے ہیں، ہم میں سے کچھ مسخ فطرت کے حامل لوگوں کو خرید کر اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں اور یوں ہمیں کمزور کر کے اور بعض اوقات ننگی جارحیت سے کام لے کر ہم پر غلبہ پانے میں کامیاب رہتے ہیں ـــــ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس حماقت میں مبتلا ہونے پر بھی تیار نہیں کہ اس صورت حال کا ذمہ دار ہم صرف بیرونی عوامل اور عناصر کو قرار دیں اور اپنی داخلی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ نہ تسلیم کریں کہ اس کی بنیادی اور حقیقی وجہ ہماری داخلی یعنی اخلاقی اور ایمانی کمزوری ہے اور اگر ہمارے بعض عناصر جاہ و مال کی خاطر بے حمیتی، دین فروشی، اخلاقی زوال کی انتہا اور ملت و قوم فروشی پر نہ اتر آئیں تو بیرونی عناصر کی سازشیں اور ان کی جارحیت شائد اتنی آسانی سے کامیاب نہ ہو سکے۔ لہٰذا ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری شکست اور ہمارے زوال میں بڑا ہاتھ ان میر جعفروں اور میر صادقوں کا ہے جو اپنے ذاتی اور حقیر مفاد اور اقتدار کی خاطر ملک دشمنی اور ملت فروشی پر اتر آتے ہیں اور دنیا و آخرت کی رسوائی مول لینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

ہماری اس تحریر کا محرک معروف ادیب و دانشور جناب عطاء الحق قاسمی صاحب کا وہ کالم بنا ہے

☆ یہ رجحان کہ ہر بات کے ڈانڈے کسی نہ کسی بیرونی سازش سے ملائے جائیں اور داخلی وجوہات کی بجائے خارجی عناصر کو مورد الزام ٹھہرایا جائے۔

جوانہوں نے ''ماتھے پر برائے فروخت کا ٹیگ'' کے عنوان سے لکھا ہے اور جس میں قاسمی صاحب نے اس تلخ حقیقت کی بعض تفصیلات کا انکشاف کیا ہے کہ کس طرح ہماری خفیہ ایجنسیاں صحافیوں کو خریدتی ہیں اور ان کے ضمیر کی قیمت لگاتی ہیں اور کس طرح بعض بے کردار صحافی اپنے قلم کی عصمت فروخت کر کے محض چند ٹکوں کی خاطر بے ضمیری پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ محض پیسوں کی خاطر اپنی فکر اور اپنی دیانت دارانہ رائے چھوڑ کر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ادارے کے کسی مالک کا کسی دوسری رائے کے اظہار کی پالیسی قبول کرنا اور اسی طرح کسی صحافی کا اس طرح کی رائے کا اظہار کرنا بلاشبہ ضمیر فروشی اور قلم و زبان کی عصمت کو فروخت کرنا ہے، یہ دنیا کا گھٹیا ترین کام ہے، جرم ہے اور ایسا کرنے والا اگر دنیا کے کسی قانون و ضابطے کی زد میں نہ بھی آئے یا ان سے بچ بھی جائے تو نہ صرف اپنے ضمیر کا مجرم ہوتا ہے بلکہ اس احکم الحاکمین کی اس عدالت سے بھی کل بچ نہ پائے گا۔ جس دن ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور جس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا۔ ہم یہ عرض کر رہے ہیں کہ یہ کام اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے لیے کیا جائے تو بھی نا قابل قبول ہے، شنیع ہے، قابل مذمت ہے لیکن اگر یہ ان بیرونی ایجنسیوں کے لیے کیا جائے جن کا ایجنڈا اسلام اور مسلم دشمنی اور پاکستان دشمنی ہے تو اس امر کی شناعت اور بُرائی میں ہزاروں گنا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ دین اور ملت فروشی کی بدترین قسم ہے جو کسی بھی شریف اور بھلے مانس مسلمان تو کیا کسی انسان کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا کام صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو بے ضمیر ہو، اخلاقی حِس سے عاری ہو، بے حمیت ہو اور ننگِ انسانیت ہو جس کا پیسے کے سوا کوئی دین و مذہب نہ ہو، اسلام تو بڑی اونچی اور بڑی دور کی چیز ہے۔

ان ٹی وی چینلز اور اخبارات کے مالکان، صحافیوں اور کارکنان کا مسلمان ہونا اور اسلام کا دعویٰ کرنا کتنا بامعنی اور باوزن ہوسکتا ہے جو عریانی اور فحاشی پھیلاتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتے ہیں کہ ''جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک سزا ہے'' (النور ۱۹:۲۴)۔ اور وہ ان یہود و نصاریٰ و کفار کی پالیسیوں کو درپردہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول بنا کر پیش کرتے ہیں اور ان کے اصل عزائم کو چھپاتے اور انہیں مسلمانوں کا خیر خواہ اور دوست باور کراتے ہیں جب کہ اللہ کہتا ہے کہ ''یہودی اور عیسائی اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کا مذہب نہ اختیار کرلو۔۔۔اور اگر تم اللہ کی طرف سے

صحیح علم آ جانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو اللہ کے مقابلے میں تمہارا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار'' (البقرۃ ۱۲۰:۲۰)۔ اور یہ کہ ''تم اہل کتاب سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے ۔۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم صاحبِ ایمان ہیں مگر جب آپس میں ملتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں'' (آلعمران ۱۱۹:۳)۔ وہ دن رات ان کے اس نظام سرمایہ داری کے مختلف نظریات و مظاہر کے حق میں پروپیگنڈا کرتے ہیں جن کی بنیاد حبّ دنیا پر ہے جب کہ اللہ کہتا ہے کہ ''جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو (آخرت پر) مقدم سمجھا تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے'' اور یہ کہ ''دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا ہے اور آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ کیا تم عقل نہیں کرتے؟'' (الانعام ۳۲:۶)۔

کیا اس صورت حال کا کوئی حل نہیں؟ حل کیوں نہیں؟ اگر حکومت چاہے تو اسلام اور نظریۂ پاکستان کے مطابق ایک ثقافتی پالیسی وضع کرسکتی ہے، اخبارات و جرائد اور ٹی وی چینلز کی سخت نگرانی کرسکتی ہے، اور خلاف ورزی کرنے والوں کے معاملات عدالت میں لا کر انہیں سزا دلواسکتی ہے لیکن اس کام کی سیاست دانوں اور حکمرانوں سے کیا توقع کی جائے کہ وہاں تو پہلے ہی میر جعفروں اور میر صادقوں کی بھرمار ہے جو اپنی کرسی کے لیے ملک توڑ دیتے ہوں اسے بیچ دیتے ہوں اور جو ڈالروں کے لیے اپنی بہو بیٹیاں تک فروخت کر دیتے ہوں اور جن کے بیرون ملک حسابات اور جائیداد کے چرچے ساری دنیا میں ہوں اور جو اپنے اقتدار کے لیے ووٹوں اور نشستوں کی خرید و فروخت کو شیر مادر کی طرح اپنا حق سمجھتے ہوں، جن کی آنکھیں مغربی فکر و تہذیب کی چکا چوند سے خیرہ ہو چکی ہوں اور جنہیں اسلامی اصول و نظریات کی حفاظت کی ذرا فکر نہ ہو وہ دوسروں کا احتساب کیا کریں گے؟ اس کے لیے اب سوسائٹی کے محب اسلام اور محب وطن عناصر کو متحد اور متحرک ہونا پڑے گا اور رائے عامہ کو بیدار کر کے ادارے بنانے ہوں گے، میڈیا کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنا ہوگی، ان کے دفتروں کے آگے احتجاج کرنا ہوگا اور عوامی دباؤ کے ذریعے ان کی اصلاح کرنا ہوگی اور صحافیوں کے بھیس میں چھپے غیر ملکی ایجنٹوں اور ایجنسیوں کے مہروں کو پکڑنا ہوگا ورنہ یہ ملک و ملت اور اس کے نظریات و اقدار کو بیچ کھائیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ معاشرہ اگر متحد و متحرک ہو جائے تو وہ سارے کام پرائیویٹ سیکٹر میں بھی کیے جاسکتے ہیں جن کی توقع ہم حکومت سے کرتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ معاشرہ کے دین دار عناصر متحد و متحرک ہو جائیں اور یہ کام کر گزریں۔

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

اتحاد بین العلماء کے لیے سعی و جہد

۱۹۸۶ء میں ناچیز کراچی سے سفر کر کے مولانا سرفراز خاں صفدرؒ کی خدمت میں گکھڑ منڈی خاص اس مقصد کے لیے حاضر ہوا کہ دیوبندی اور بریلوی مکاتبِ فکر کے درمیان جو خلیج بڑھتی جا رہی ہے اسے کم بلکہ ختم کرنے کی راہ تلاش کی جائے۔ اس مقصد کے لیے پہلے بھی ہماری کئی ملاقاتیں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب سابق مہتمم دارالعلوم نعیمیہ لاہور، مفتی ظفر علی نعمانی صاحب سابق مہتمم دارالعلوم امجدیہ کراچی، علامہ عبدالمصطفیٰ الأزہری صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم امجدیہ کراچی اور مولانا محمد شفیع اوکاڑوی صاحب وغیرھم۔ رحمھم اللہ۔ سے ہو چکی تھیں، ان سب حضرات کا تعلق بریلوی مکتبۂ فکر سے ہے، ان ملاقاتوں سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ عقائد کے باب میں دونوں مکاتبِ فکر کا اختلاف بڑی حد تک صرف تعبیر اور الفاظ کا اختلاف ہے، حقیقت میں ایسا کوئی اختلاف عقائد کے باب میں نہیں ہے کہ جس کی بناء پر ایک دوسرے کو گمراہ اور فاسق قرار دیا جائے۔ ہاں! بہت سے اعمال میں یہ اختلاف ضرور ہے کہ ہم انہیں بدعت کہتے ہیں، اور ان کے نزدیک وہ بدعت میں داخل نہیں۔

مولانا مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے تو مجھ سے اور برادرِ عزیز مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے پوری وضاحت سے یہ کہا تھا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف کا باعث حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب 'حفظ الایمان' کی چند سطری عبارت ہے۔ اس عبارت کو بیچ سے نکال دیا جائے تو پھر ہمارے اور آپ کے درمیان عقائد کا کوئی اختلاف نہیں۔ اس پر ہم نے ان سے کہا تھا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے سرتاج ہیں، اور ان کی اُس عبارت کے جو معنیٰ بہت سے حضرات نے بیان کیے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اُس باطل معنیٰ کے مراد لینے سے بالکل بری ہیں، اور حضرت حکیم

الامت جیسی حُبِّ رسول سے سرشار شخصیت کے بارے میں دور دور امکان نہیں کہ انھوں نے ایسے غلط معنیٰ مراد لیے ہوں۔ اس عبارت کے جو صحیح معنیٰ ذرا سی توجہ سے سمجھ میں آجاتے ہیں، وہی حضرت کی بھی مراد ہے، چنانچہ انہوں نے بعد میں اس کی وضاحت بھی فرمادی تھی اور اُس غلط معنیٰ سے مکمل برأت کا بھی دوٹوک اعلان فرمادیا تھا، لیکن اگر ان کی اس عبارت کو شائع کرنے سے روک دینا، امت کو پھوٹ سے بچانے، اور ان دونوں مکاتب فکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ اس کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کے لیے مشورے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اور آپ کو مل کر اس کے لیے پیش رفت کرنی چاہیے، اور طے ہوا تھا کہ دونوں طرف کے علماء کرام کا اجتماع اس غرض کے لیے بلایا جائے گا۔ لیکن ملک میں اچانک ایسے حالات پیش آئے اور آتے گئے کہ یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔

پھر صدر ضیاء الحق صاحب مرحوم کے دور میں بریلوی مکتبۂ فکر کے مشہور عالم دین مولانا محمد شفیع اوکاڑوی صاحبؒ نے مجھ سے اسلام آباد میں علماء کنونشن کے موقع پر ملاقات فرمائی، جو ہماری پہلی اور آخری ملاقات ثابت ہوئی، کیونکہ اس کے تقریباً ڈیڑھ دو مہینے بعد ان کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ اس ملاقات میں مولانا اوکاڑوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے واضح الفاظ میں فرمایا تھا کہ امت میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے، مجھے خطرہ ہے کہ اس بارے میں آخرت میں پوچھ ہوگی۔ مَیں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اپنی تقریروں میں بار بار سخت کلامی کی ہے، لیکن جب میں نے ان کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے اور ان کے عقائد میں کوئی فرق نہیں۔ اور ان کی کتاب 'حفظ الایمان' کی جو چند سطری عبارت اب تک کشیدگی کا باعث بنی رہی ہے، اُس کے بارے میں مولانا اوکاڑوی صاحب نے فرمایا کہ اب تو خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے قلم سے اس کی ایسی توضیح اور توجیہ شائع ہوگئی ہے اس کے بعد یہ عبارت بھی نزاعی نہیں رہی، اس لیے مجھے آپ دونوں بھائیوں سے توقع ہے کہ اگر ہم مل جل کر کام کریں تو امت کو پھوٹ سے بچایا جاسکتا ہے، ورنہ اللہ کے یہاں ہم سے پوچھ ہوگی۔

میں نے ان سے کہا تھا کہ یہ تو آپ میرے دل کی بات کہہ رہے ہیں، ہمارے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کے آخری کئی سال اس

کوشش میں صَرف فرمائے ہیں، اور میں بھی کئی سال سے اس کاوش میں لگا ہوا ہوں، چنانچہ میرے اور مولانا اوکاڑوی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے درمیان طے ہوا کہ وہ اور ہم اپنے اپنے رفقاء اور اہل علم سے رابطہ کرکے اس میں پیش رفت کریں گے، پھر دونوں طرف کے خاص خاص علماء کرام کا مشترکہ اجلاس ہوگا، پھر نسبتاً بڑے پیمانے پر دونوں طرف کے حضرات کا دوسرا اجلاس ہوگا، ان اجلاسوں میں اتفاق ہوجانے کے بعد ملک گیر پیمانے پر دونوں طرف کے علماء و مشائخ کا کنونشن بلا کر اس میں اعلان کردیا جائے گا کہ عقائد میں اب ہمارا کوئی اختلاف نہیں۔لیکن کراچی واپس آکر ناچیز کا اہل علم سے مشوروں کا سلسلہ جاری ہی تھا، اور اس کا طریقۂ کار بڑے پیمانے پر طے کیا جارہا تھا کہ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی اچانک وفات ہوگئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی کامل مغفرت فرمائے۔

بعد ازاں ان کے صاحب زادے مولانا کوکب نورانی صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، وہ بھی کئی بار دارالعلوم کراچی تشریف لائے اور ہر بار مولانا محمد شفیع اوکاڑوی صاحب کی اس ملاقات کا ذکر آیا لیکن افسوس ہے کہ اس کے بعد کوئی عملی پیش رفت نہ ہوسکی اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں اور

ہم خواتین کی تعلیم کے مخالف نہیں

کالعدم تنظیم تحریک طالبان پاکستان نے کہا ہے کہ وہ کبھی بھی خواتین کی تعلیم کے مخالف نہیں رہے بلکہ وہ صرف سیکولر اور مغربی تعلیم کے خلاف ہیں جس میں ساری توجہ صرف دنیاوی تعلیم پر دی جاتی ہے۔ یہ بات ترجمان احسان اللہ احسان نے سوات کی طالبہ ملالہ یوسف زئی کو عالمی امن ایوارڈ کے لیے نامزدگی کے تناظر میں کہی۔ (بی بی سی/نوائے وقت لاہور، ۲۰ نومبر ۲۰۱۱ء)

مسلمانوں کی سادہ لوحی یا جذباتیت کے باعث یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر محمد امین

علماء کرام خبردار رہیں

امریکی اشیر باد سے کام کرنے والی این جی اوز علماء اور دینی مدارس پہ کام کررہی ہیں

سنٹر فار امریکن پروگریس (Center for American Progress) نامی ایک امریکی تھنک ٹینک نے پچھلے دنوں اُن امریکی تھنک ٹینکس کی 'تحقیقی' سرگرمیوں کا بھانڈا پھوڑ دیا جو اسلام اور مسلم دشمنی کے لیے کام کررہے ہیں۔ اور کسی دن اُن تھنک ٹینکس کی سرگرمیوں کی تفصیلات بھی ان شاء اللہ کوئی امریکی ادارہ ہی مہیا کردے گا جو امریکی ادارے مسلم ممالک خصوصاً پاکستان میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

امریکہ و یورپ کے بعض پاکستانی موالیوں نے ان کی مالی معاونت سے ایسے ادارے اور این جی اوز بنا رکھی ہیں جو ان مغربی تھنک ٹینکس اور اداروں کے لیے کام کرتی ہیں۔ یہ لوگ پاکستان میں ہر شعبے میں کام کرتے ہیں اور ان میں سے بعض علماء اور دینی مدارس پہ بھی کام کررہے ہیں۔ علماء کرام کو پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ اسے ایک نیک دینی کام سمجھ کر ان سے تعاون کرتے ہیں اور ان کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ خاصا لمبا کھکھیڑ ہے اور اس کی تفصیلات میں جانے کے لیے خاصی محنت اور وسائل کی ضرورت ہے۔ فوری طور پر جو چند چیزیں ہمارے علم میں آئی ہیں وہ ہم علماء کرام کے علم میں لا رہے ہیں تاکہ وہ خبردار رہیں۔

ڈیڑھ دو سال پہلے ایک امریکی ادارے نے ایک دینی جماعت کے اسلام آباد کے ایک ادارے سے مل کر پی سی بھوربن میں دینی جرائد کے ایڈیٹرز کی تین روزہ کانفرنس رکھی تھی۔ اس کا دوسرا اجلاس نیپال میں ہوا تھا۔ گوجرانوالہ سے شائع ہونے والے ایک دینی جریدے کے ایڈیٹر صاحب نے نہ

صرف ان پروگراموں میں شرکت کی بلکہ ان کی روداد یں، ان کے 'تعمیری' اور 'اچھے' پہلوؤں کو ابھارتے ہوئے شائع کی تھیں۔ اسلام آباد کے اسی ادارے کی ایک ٹیم نے امریکیوں کے لیے کام کرتے ہوئے اسلامی یونیورسٹی میں کئی ورکشاپس منعقد کیں، دینی مدارس کے دورے کیے اور وہاں تربیتی اجلاس رکھے۔ لاہور کا اجلاس جامعہ لاہور الاسلامیہ (رحمانیہ) کی لائبریری میں ہوا تھا۔ پھر اسی یونیورسٹی کے ایک تحقیقی شعبے نے ایک امریکی تھنک ٹینک کے کہنے پر لاہور اور وسطی پنجاب کے دیوبندی مدارس کا ایک سروے کرایا تاکہ یہ دیکھا جائے کہ طالبان کے کتنے اثرات یہاں تک پہنچے ہیں؟ ایک اسکیم کے تحت اس 'اسلامی' یونیورسٹی میں ایسے لوگ امریکہ سے یا امریکہ ٹرینڈ اعلیٰ انتظامی عہدوں پر لائے گئے ہیں جو اسے ایک 'سیکولر' اور 'ماڈرن' یونیورسٹی بنا رہے ہیں اور اس میں وہ تقریباً کامیاب ہو چکے ہیں۔

اسی طرح کا ایک اسلام آبادی ادارہ آج کل فروغ امن کے نام پر تکفیر کے خلاف کام کر رہا ہے اور امریکی وحکومتی مؤقف کی حمایت کرنے والے علماء کے ساتھ ساتھ عام علماء کو بھی ہوٹلوں میں رکھے جانے والے شاندار پروگراموں میں بلا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سارے مسالک کے علماء کرام کو طالبان کے خلاف جمع کیا جائے جو علاقے میں امریکی غلبے کے خلاف لڑ رہے ہیں اور ان کے مقامی سیاسی اور عسکری حلیفوں کے خلاف

قرآن اور قرآنی عربی سیکھیے
آغاز کلاسز 21 نومبر 2011ء
قرآنی عربی کلاسز | پیر، بدھ، جمعہ بعد از نماز مغرب
مدرس | مولانا زاہد محمود
مطالعہ قرآن مع عربی گرامر | جمعہ، ہفتہ بعد از نماز عصر
مدرس | پروفیسر ڈاکٹر محمد امین
دورانیہ ایک گھنٹہ
صفاء اسلامک سنٹر
A-71، فیصل ٹاؤن، لاہور
0333-4233 581، 0333-520 3051، 0300-460 9522
ویب: www.safa.edu.pk، ای میل: ermpak@hotmail.com

کفر و جہاد کا فتویٰ دیتے ہیں۔

ہم یہ باتیں علماء کرام کے علم میں اس لیے لا رہے ہیں تا کہ وہ ان لوگوں کی چالوں سے ہوشیار رہیں اور یا تو ان کے اجلاسوں کا بائیکاٹ کریں یا مل کر ان کے مؤقف کو جھٹلائیں اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنائیں۔

یہ ایک اہم اور زندہ موضوع ہے جس پر سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔ جو مکالمہ ہم یہاں دے رہے ہیں وہ جماعت اسلامی سے ہمدردی رکھنے والے دو دانشوروں کے درمیان ہے اور انہوں نے جماعت ہی کے حوالے سے گفتگو کی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک وسیع الاطراف موضوع ہے۔ یہ پاکستان کی ساری دینی سیاسی جماعتوں کا مسئلہ ہے بلکہ ایک لحاظ سے سارے عالم اسلام کا مسئلہ ہے کہ ترکی میں ایک اسلامی جماعت برسر اقتدار ہے، تیونس میں ایک اسلامی جماعت اکثریت حاصل کر چکی ہے اور مصر اور دوسری جگہوں پر اسلامی تحریکوں کی جدوجہد جاری ہے بلکہ خود پاکستان کے ایک صوبے میں دینی جماعتیں برسر اقتدار رہ چکی ہیں۔ لہٰذا اس سوال پر غور وفکر ضروری ہے کہ کیا مغربی جمہوریت کے ذریعے (جس میں چند لفظی آئینی تبدیلیاں کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا گیا ہے) اسلامی انقلاب (یا غلبۂ اسلام/ نفاذ شریعت/ نظام مصطفی وغیرہ) کی منزل حاصل کی جا سکتی ہے؟ اس حوالے سے ایک مکالمہ تو آپ ابھی ملاحظہ فرمایئے ہم اپنی رائے کا اظہار، ان شاء اللہ، البرہان کے اگلے شمارے میں کریں گے۔ امین

پاکستانیات/مکالمہ

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

کیا جمہوریت کے ذریعے اسلامی انقلاب ممکن ہے؟

فرائیڈے سپیشل مورخہ ۹ تا ۱۵ ستمبر میں جناب شاہ نواز فاروقی صاحب نے اپنے مضمون 'جماعت اسلامی کی بے مثال نظریاتی، تاریخی اور سیاسی جدوجہد' کے عنوان سے جس بحث کا آغاز کیا ہے وہ نہایت اہم ہے۔انہوں نے جماعت کی طاقت کے جو مظاہر گنوائے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مولانا مودودیؒ کا تصور اسلام بحیثیت ایک نظام حیات جو عالم پہ غلبہ کا متقاضی ہے۔ جو عملاً ممکن ہے اور اب ایک عالمگیر عمل بن گیا ہے، بقول جناب فاروقی ''جماعت اسلامی کی رسائی دنیا کی کسی بھی دوسری پارٹی سے بڑھ کر ہے'' (صفحہ ۱۱)۔

۲۔ ''پاکستان کے اسلام کے نام پر وجود میں آنے کی بات جو جماعت اسلامی کے زبردست پروپیگنڈا کا حاصل ہے۔ صحیح نہیں ہے تاہم پاکستان کے نظریاتی تشخص، دفاع اور فروغ کے حوالے سے جماعت اسلامی کو اہم مقام حاصل ہے'' اور لبرل و کمیونسٹ حضرات جماعت اسلامی کو اپنا اصل حریف گردانتے ہیں (صفحہ ۱۱)۔

۳۔ جماعت اسلامی نے طلبہ اور مزدور یونینوں میں کمیونسٹ اور لبرل عناصر کو شکست دی ہے (صفحہ ۱۱)۔

۴۔ جماعت اسلامی نے دستوری اور جمہوری جدوجہد اور مہمات میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور جماعت اسلامی کے تعاون کے بغیر جمہوری اور اسلامی اتحاد کو فعال کرنا ناممکن رہا ہے (صفحہ ۱۲)۔

۵۔ جماعت اسلامی اتحاد امت کی علامت ہے اور تمام انسانیت کو متحد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے (صفحہ ۱۲)۔

۶۔ جماعت اسلامی میں پیہم انتخابی شکستوں کو جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے (صفحہ ۱۲)۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ طاقت ایک کثیر الجہتی تصور ہے۔ طاقت کے لغوی معنیٰ 'مقصد کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے' جماعت اسلامی کا مقصد وجود 'حصول رضائے الٰہی' ہے ان معنوں میں جماعت اسلامی یقیناً طاقتور ہے کہ اس کے مخلص متوسلین جماعت کا ساتھ دے کر اللہ کی رضا کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور ان شاء اللہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں لیکن جماعت اسلامی ان معنوں میں طاقتور نہیں ہے کہ حصول رضائے الٰہی کو بحیثیت مقصد فروغ دینے کے لیے اس نے جو طریقہ کار وضع کیا ہے وہ معاشرتی اور ریاستی غلبہ حاصل کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر

آنے والے دن کے ساتھ یہ طریقہ زیادہ غیر مؤثر ہوتا جا رہا ہے۔

میری یہ رائے بھی ہے کہ جماعت اسلامی نے جو طاقت جدوجہد سے حاصل کی ہے وہ دن بہ دن محدود ہوتی جا رہی ہے اور اگر ہم نے اپنے نظریات اور رائج شدہ حکمت عملی پہ نظر ثانی نہ کی تو عنقریب ہم معاشرتی اور ریاستی سطح پر قطعاً مفلوج ہو کر رہ جائیں گے۔

محترم فاروقی صاحب نے جماعت اسلامی کی جن طاقتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اگر ہم ان کا تجزیہ کریں تو جماعت اسلامی کے طریق کار کی بڑھتی ہوئی فرسودگی (obsolence) واضح ہو جاتی ہے۔ طریق کار کی اس فرسودگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گو کہ مولانا مودودیؒ نے مغرب کو جاہلیت خالصہ قرار دیا لیکن مغربی فکر اور عمل کی جو تنقید مولانا مودودیؒ نے پیش کی ہے وہ ایک نامکمل اور جزوی تنقید تھی۔ مولانا مودودیؒ کی اس جزوی تنقید کی سب سے اہم مثال آپ کی سیاسی فکر میں موجود ہے۔ آپ اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن اس نظام حیات کی تنفیذ کے لیے ایک جمہوری ریاستی عمل کو کافی سمجھتے ہیں۔ آپ کا تصور انقلاب ان معنی میں محدود ہے کہ آپ سرمایہ دارانہ جمہوری ریاستی نظام کے انہدام کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اسی ریاستی نظام کے کلیدی اداروں (انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ) کو غلبۂ دین کا آلہ بنانے پر زور دیتے ہیں۔ چونکہ مولانا مودودیؒ کی فکر میں تنویری طریقہ علمیت پر کوئی تنقید موجود نہیں لہٰذا آپ جمہوری ریاست کو سرمایہ دارانہ حاکمیت کو بروئے کار لانے والی ادارتی صف بندی کے طور پر نہیں پہچانتے بلکہ جب آپ اسلامی ریاست کے خدوخال بیان فرماتے ہیں تو وہاں سلطنت کی تردید تو ملتی ہے جمہوریت کی نہیں۔ آپ کی رائے میں خلافت راشدہ شرع کے پابند ایک جمہوری نظام کے سوا اور کچھ نہیں۔ مولانا مودودیؒ کی فکر کو اپنا کر جماعت اسلامی نے جو جدوجہد کی (خواہ وہ پاکستان میں ہو بنگلہ دیش میں یا ہندوستان میں) وہ جمہوری انہی معنوں میں ہے کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں اسلامی ریاست جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے دور سے لے کر سلطان عبدالحمید ثانیؒ کے دور تک قائم تھی، کبھی وجود میں نہ آسکے گی بلکہ جمہوری نظام کو اسلامی جواز فراہم کیا جائے گا۔ جمہوری عمل ارادۂ عمومی (general will) کی حاکمیت کا اظہار ہے۔ اور ارادۂ عمومی کی حاکمیت آزادی کو فروغ دیتی ہے بندگیٔ رب اور رضائے الٰہی کے حصول کو فروغ نہیں دیتی۔

دستوری اور جمہوری جدوجہد کی کامیابی، خواہ اس کی توجیہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، حصول رضائے الٰہی کی جدوجہد کو فروغ نہیں دیتی۔ ان تحاریک کی کامیابی سے اسلامی انقلابی جدوجہد سوشل

ڈیموکریٹ اور لبرل آدرشوں میں تحلیل ہوجاتی ہے۔ یہ بات لیاقت علی خان نے ۱۹۴۹ء میں خوب اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ پاکستان کی جمہوری ریاست کو اسلامی جواز دینا پاکستان میں ایک اسلامی ریاست تعمیر کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

جیسا کہ ترکی کے تجربے سے ثابت ہوا ہے جمہوری عمل میں شمولیت سے پارٹی ریاست پر قبضہ حاصل نہیں کرتی بلکہ جمہوری ریاستی نظام اسلامی پارٹی پر قبضہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ عمل پاکستان میں تو نامکمل ہے کیوں کہ ہم انتخابات ہارتے رہے ہیں (اور یہ اللہ کا ہم پر بڑا احسان ہے) لیکن عرب دنیا میں حالیہ جدوجہد کا یہی نتیجہ متوقع ہے اور اگر یہ بات درست ہے کہ عرب اسلامی تحاریک مولانا مودودیؒ کی فکر کی غماز ہیں تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس فکر نے پوری مسلم دنیا میں جمہوری نظام کو اسلامی جواز فراہم کرنے میں اور اسلامی ریاستی نظام کے قیام کو ناممکن بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات اس سے واضح ہے کہ اسلامی جماعتوں اور طلبہ اور مزدور یونینوں اور قوم پرست اور سوشل ڈیموکریٹ پارٹیوں اور یونینوں کے منشوروں اور پروگراموں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

جمہوری عمل معاشرے میں سیکولرائیزیشن (secularization) کو فروغ دینے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ جیسے جیسے جمہوری عمل کو قبولیت عامہ حاصل ہوتی ہے ویسے ویسے دینی عصبیت معدوم ہوتی جاتی ہے اور غیر سیکولر جماعتوں کے لیے کارکنوں سے قربانیاں مانگنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔اس وجہ سے اسلامی جماعتوں کی گفتگو تو غیر مذہبی رہتی ہے لیکن وہ اپنے عمل کو بتدریج سیکولر بنانے پر مجبور ہوجاتی ہیں کیوں کہ سیکولر معاشروں میں کسی سیاسی عمل کی مقبولیت صرف عوام کے حقوق اور اغراض (interests) کے فروغ میں ہی متعین ہوسکتی ہے۔ ان حالات میں اسلامی جماعتیں اپنی بقاء کی خاطر نظام سے ٹکراؤ سے گریز کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ یہ خطرہ مولانا امین احسن اصلاحی نے ۱۹۵۷ء کے تاریخ ساز ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں پہچان لیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ''جماعتیں قائم تو ہوتی ہیں کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے لیکن قائم ہوجانے کے بعد رفتہ رفتہ از خود مقصد اور نصب العین بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہوجاتا ہے''۔

آج جماعت اسلامی (بالخصوص کراچی میں) اپنی بقاء کو محفوظ رکھنے کے لیے سیکولر قوتوں سے تصادم سے گریز کر رہی ہے اور جمہوری عمل میں پناہ حاصل کر رہی ہے۔ یہ بات اس کی واضح دلیل ہے کہ کارکنوں میں اسلامی عصبیت اور شوق شہادت معدوم ہوتا جا رہا ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا معاشرتی سیکولرائزیشن کا عمل جماعت اسلامی کو ایک عام جمہوری تنظیم بناتا چلا جائے گا۔ اس

صورت میں جماعت اسلامی کی طاقت بڑھ بھی سکتی ہے ان معنوں میں کہ جمہوری عمل کو اسلامی جواز فراہم کرنا مقبول عام ہوجائے لیکن ان معنوں میں نہیں کہ حکومت الٰہیہ قائم ہو کیوں کہ ارادۂ عمومی کی حاکمیت لازماً بندگیٔ رب کی نفی کرتی ہے۔ اگر اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے تاکہ ہماری طاقت حکومت الٰہیہ کے لیے صَرف ہوتو ہمیں لازماً مولانا مودودیؒ کی فکر کی تکمیل کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ اگر اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے تو اس کی تنفیذ کے لیے ایک اسلامی ریاست کا قیام لازمی ہے۔ اسلامی ریاست خلافت ہے، امارت ہے، سلطنت ہے لیکن جمہوریت نہیں ہے۔ جمہوری انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ میں شمولیت کے ذریعہ اسلامی اقتدار قائم نہیں کیا جاسکتا۔

جماعت اسلامی کو ایسی جدوجہد کا آغاز کرنا چاہیے جو سیکولر ریاستی اداروں کو اسلامی اقتدار کے ماتحت لانے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اسلامی ریاستی صف بندی کسی دستوری شکنجہ کی پابند نہیں ہوسکتی نہ اس صف بندی کا آغاز کرنے کے لیے ایک اسلامی حکومت کا قیام اوروجود ضروری ہے۔ اس ادارتی ریاستی صف بندی کی بنیاد بین المساجد اتحاد فراہم کرسکتا ہے۔ جماعت اسلامی کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے بنیادی مخاطب عوام نہیں بلکہ ملک بھر کی اسلامی تنظیموں اور گروہوں کے کارکن ہیں۔ اسلامی انقلابی عمل اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کے کارکنوں کو ملک کی طول وعرض میں پھیلی ہوئی لاکھوں مساجد میں مجتمع کیا جائے اور محلے بازار کی سطح پر یہ اقتدار سیکولر ریاستی اداروں سے ان مساجد میں منتقل کیا جائے۔ یہ اسلامی انقلابی عمل کی بنیاد فراہم کرسکتا ہے اور قوت کی اس نئی ترتیب کی بنیاد پر ہم جمہوری ریاست کو مؤثر طریقے سے چیلنج کرسکتے ہیں۔

پاکستانیات ڈاکٹر محمد امین

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں

ناکامی کے اسباب —— کامیابی کا لائحہ عمل

ایسا عام طور پر نہیں ہوتا کہ کوئی فرد/ ادارہ یا تنظیم جو کام کرنے اٹھے اس میں وہ یکسر ناکام ہوجائے اور بالعموم یہی دیکھا گیا ہے کہ خواہ افرد ہوں خواہ اجتماعی ادارے وہ اپنے طے کردہ اہداف کے حصول میں کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کرتے ہیں اور بعض کے حصول میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی کی نسبت (Ratio) کم وبیش ہوسکتی ہے لیکن بالعموم موجود ہوتی ہے لہٰذا پاکستان کی دینی سیاسی

جماعتوں کے بارے میں یہ کہنا شائد قرین انصاف نہ ہو کہ وہ کلی طور پر ناکام ہوگئی ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے کچھ کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں لہٰذا ان کی ناکامیوں کے ذکر سے پہلے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ان کی کامیابیوں کا بھی کچھ ذکر کر دیا جائے۔

کامیابیاں

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں نے پاکستان کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لیے سخت جدوجہد کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور عوام کے تعاون سے اس میں قابل ذکر کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں خصوصاً ان کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی کہ پہلے جدوجہد کر کے کچھ بنیادی اسلامی اصول منوا لیے جائیں اور انہیں آئین پاکستان کا حصہ بنا دیا جائے اور پھر آئندہ اس آئین کے تحت معاشرے اور ریاست کی مزید اسلامائزیشن کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے۔ چنانچہ دینی قوتوں نے قیام پاکستان کے آغاز ہی میں دباؤ ڈال کر آئین ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد پاس کرالی اور اسے آئین کا حصہ بنوا کر گویا ہمیشہ کے لیے یہ طے کر دیا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی جو مسلم عوام کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے میں مدد دینے کے لیے اقدامات کرے گی۔ ریاست کے کردار کو عملاً اسلامی بنانے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت اور ادارہ تحقیقات اسلامی جیسے آئینی ادارے کسی حد تک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے اسلامی قوانین جیسے حدود لاز، قصاص و دیت، قانون شہادت، زکوٰۃ وعشر، احترام رمضان، امتناع سود و قادیانیت، ارکان اسمبلی میں مطلوب اخلاقی صفات سے متعلق آئین کے آرٹیکلز ۶۲، ۶۳ وغیرہ ریاست کے اسلامی چہرے کو اجاگر کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سارے حاصلات اور یہ کامیابیاں ہماری دینی سیاسی جماعتوں کی مسلسل کوششوں اور جدوجہد کا نتیجہ ہیں جس کے لیے وہ بجا طور پر مستحق ستائش وتبریک ہیں۔

ناکامیاں

تاہم اگر اس ہدف ومقصد کو سامنے رکھا جائے جو ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے پیش نظر تھا اور وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ صحیح اسلامی معاشرہ اور مثالی اسلامی ریاست قائم کریں اور اقتدار میں آ کر اسلامی تعلیمات کو معاشرے میں عملاً نافذ کر دیں تا کہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں

اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر دنیا و آخرت کی حسنات سمیٹ سکیں،تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جہاں دینی سیاسی جماعتیں کافی کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں وہاں بہت کچھ ایسا بھی ہے جو وہ حاصل نہیں کر پائیں۔ ایک بنیادی بات یہ ہے کہ عوام نے انہیں ووٹ نہیں دیے اور وہ آج تک برسر اقتدار نہیں آسکیں (ماسوائے صوبائی سطح کی ایک آدھ کامیابی کے) کہ وہ معاشرے اور ریاست کے اسلامی کردار کے حوالے سے اپنے طے کردہ بڑے بڑے اسلامی مقاصد حاصل کر سکتیں۔ آیئے یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی اس ناکامی کے پیچھے کون سے عوامل پنہاں ہیں کیونکہ جب تک ہم ناکامی کے اسباب کا تعین نہیں کریں گے ان کا علاج نہیں کر سکیں گے۔

ناکامیوں کے اسباب

ہماری طالب علمانہ رائے میں دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامیوں کے اسباب کے دو بڑے پہلو ہیں: ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔

خارجی اسباب

مغربی طاقتوں کا کردار: خارجی لحاظ سے جن دو عوامل نے پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کو ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں سرفہرست اسلام اور مسلم دشمن مغربی طاقتوں کا کردار ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ و یورپ (بشمول ان کے حلیف بھارت، اسرائیل اور روس وغیرہ کہ **الکفر ملۃواحدۃ**) کا کردار اسلام اور مسلم دشمنی پر مبنی ہے۔ یہ وہ ممالک ہیں جنہوں نے ماضی میں مسلم ممالک کو غلام بنائے رکھا اور ان کا بھرپور معاشی اور سیاسی استحصال کیا اور اب ان کی بھرپور کوشش ہے کہ وہ عالم اسلام خصوصاً پاکستان میں (جو اسلام کے نعرے پر وجود میں آیا تھا) اسلام نافذ نہ ہونے دیں کیونکہ دین پر عمل ہی مسلمانوں کی ترقی،خوشحالی اور قوت کا منبع ہے۔ اس لیے یہ ممالک اپنی علی الاعلان پالیسیوں کے ذریعے ترقی،خوشحالی ، امن، جمہوریت، تعلیم، تجارت اور میڈیا جیسے خوبصورت عناوین کے تحت اور اپنی خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے سازشیں کر کے اپنی لے پالک مقامی حکومتوں کی مدد سے اسلامی قوتوں کو آپس میں لڑانے، انہیں الیکشن میں ہرانے اور انہیں سوسائٹی میں غیر مؤثر بنانے کے لیے شروع دن سے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتی آئی ہیں اور اب بھی کر رہی ہیں۔

۲۔ مقامی گماشتہ حکومتیں

اس سلسلے میں مغربی طاقتوں کی اولیں کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے لے پالک، تنخواہ دار اور گماشتہ عناصر کو اقتدار میں لائیں اور ان کے ذریعے ریاست کی پوری طاقت اور وسائل اسلامی قوتوں کے خلاف استعمال کریں۔ بدقسمتی سے یہ کھیل وہ پاکستان میں اول روز سے کامیابی سے کھیل رہی ہیں اور انہوں نے پاکستان میں اپنی مرضی کی سول اور فوجی حکومتیں قائم کی ہیں اور ان کے ذریعے، قرض اور امداد کے نام پر، پاکستانی معیشت کو تباہ کیا ہے، تعلیم اور میڈیا میں دراندازی کر کے غیر اسلامی رجحانات و اقدار کی آبیاری کی ہے اور ان سیکولر مقامی حکومتوں نے اقتدار میں آنے، اسلامی عناصر کو دبانے، ہرانے، باہم لڑانے اور غیر مؤثر کرنے کے لیے ہر حربہ اختیار کیا ہے اور کر رہی ہیں۔ نیز وہ ریاستی وسائل دینی عناصر کو غیر مؤثر کرنے اور ناکام بنانے میں، خفیہ اور اعلانیہ، صَرف کرتی آ رہی ہیں اور آج بھی کر رہی ہیں۔

یہ تو تھے خارجی اسباب۔ اب آیئے داخلی اسباب کی طرف:

داخلی اسباب

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کے داخلی اسباب تو کئی ایک ہیں لیکن ہماری رائے میں ان میں سے تین زیادہ اہم ہیں: ایک خارجی منفی عوامل کا توڑ نہ کرسکنا، دوسرے ان کا باہمی انتشار و افتراق اور تیسرے کامیابی کے لیے صرف سیاسی سرگرمیوں پر انحصار۔ اور اب ان عوامل کی کچھ تفصیل:

۱۔ خارجی منفی عوامل کا توڑ نہ کرسکنا

دینی سیاسی جماعتوں کے رویے سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے خلاف بین الاقوامی اسلام و مسلم دشمن طاقتوں کے ارادوں اور سازشوں کا صحیح ادراک نہیں کرسکیں اور نہ انہوں نے ان کی چالوں سے بچنے اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے مؤثر اقدامات کیے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اسلام و مسلم دشمن عالمی قوتوں کے مقامی مہروں اور گماشتوں کے زہر سے خود کو بچانے کا بھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا اور نہ عالمی و مقامی خفیہ ایجنسیوں کی سازشوں کے توڑ کے لیے کچھ کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بین الاقوامی اور مقامی خفیہ ایجنسیاں انہیں آپس میں لڑانے، کمزور کرنے اور غیر مؤثر بنانے میں اب تک کامیاب رہی ہیں۔

۲۔ باہمی انتشار و افتراق

ہمارے تجزیے کے مطابق بین الاقوامی اور مقامی خفیہ ایجنسیوں نے پاکستان کے ہر دینی مسلک

اور مکتب فکر کو اکسایا کہ وہ اپنے اپنے مسلک کی الگ سیاسی جماعت بنائے، پھر انتخابات میں ان کو آپس میں لڑایا، ان کی ہوا خیزی کی اور یوں ان کی شکست کا بندوبست کیا تا کہ سیکولر جماعتیں کامیاب ہوجائیں۔ بدقسمتی سے ہماری دینی سیاسی جماعتیں اس کھیل کو سمجھ نہیں سکیں، اسے ناکام نہیں بنا سکیں اور خفیہ ایجنسیوں کو حبِّ مال اور حبِّ جاہ کے ایسے مریض دینی عناصر میں سے بالعموم ملتے رہے ہیں جو ان کا کھیل کھیلنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں ورنہ اس بات کو سمجھنے کے لیے کتنی فراست درکار ہے کہ اپنے اپنے مسلک کی سیاسی جماعت بنانا خود ناکامی کو دعوت دینے کے مترادف ہے کیونکہ ایک سیاسی جماعت اگر کلامی و فقہی مسلک پر مبنی ہوگی تو منطقی طور پر دوسرے مسلک کا فرد اسے ووٹ نہیں دے گا۔ نیز اس سے دینی عناصر اور عوام میں فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ صرف سیاسی سرگرمیوں پر انحصار

ہماری دینی سیاسی جماعتوں نے انتخابات میں کامیابی کے لیے صرف دینی اور سیاسی سرگرمیوں پر انحصار کیا ہے اور تعلیمی، اصلاحی، سماجی، ثقافتی اور خدمت خلق کی سرگرمیوں پر بھرپور توجہ نہیں دی جبکہ ہمارا سیاسی کلچر یہ ہے کہ صرف اس سیاست دان کو کامیاب سمجھا جاتا ہے جو لوگوں کے تھانے کچہری کے کام کرائے، ان کو ملازمتیں دلوائے، ان کے تبادلے کرائے، گلی محلے کی صفائی میں مدد دے، سڑکیں بنوائے اور ان کاموں پر اپنا مال اور وقت صرف کرے۔ سوء اتفاق سے ہمارے علماء کرام اس اسٹائل سے کام کرنے کے عادی نہیں ہیں اور نہ ان کی اکثریت اس طرح کی زندگی گزارتی ہے لہٰذا عوام علماء کرام کی دینی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا احترام تو کرتے ہیں لیکن انہیں ووٹ دے کر کرسئ اقتدار تک پہنچانے کے لیے موزوں نہیں سمجھتے اور یوں علماء کرام سیاست میں عوام کی تائید حاصل نہیں کر پاتے۔

پس چہ بائد کرد

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں کیسے کامیاب ہوسکتی ہیں؟ ایسی کیا حکمت عملی ہوسکتی ہے جس پر وہ عمل کریں تو انہیں عوام کی حمایت حاصل ہوجائے اور وہ برسر اقتدار آ کر ریاستی قوت کو اسلامی تعلیمات پر عمل کے لیے استعمال کرسکیں؟ اس کے لیے ہم تین نکاتی لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں: ۱۔ باہمی اتحاد ۲۔عوام کی ذہن سازی؛ اور ۳۔خدمت خلق۔

۱۔ باہمی اتحاد

اصول کی بات تو یہ ہے کہ سارے دینی عناصر کو مل کر ایک سیاسی جماعت بنانی چاہیے کیونکہ ہدف سب کا ایک ہے کہ ریاستی امور کو اسلام کے مطابق چلانا ہے اور فرد اور معاشرے کو اسلامی تعلیمات پر عمل کے قابل بنانا ہے۔ یہی نفاذ شریعت ہے اور اس پر کسی کا اختلاف نہیں۔ جہاں تک نفاذ شریعت کی تفصیلات اور دیگر سیاسی و اجتماعی امور کا تعلق ہے ان میں بھی دینی سیاسی عناصر میں مشترکات اتنے زیادہ ہیں کہ ان پر متفق ہونا کچھ مشکل نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اخلاص اور فراست عطا فرمائیں اور حبّ جاہ و مال اور خفیہ ایجنسیوں کی سازشوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں اور 'میں سب سے بڑا لیڈر ہوں' اور 'مجھے سب کا لیڈر ہونا چاہیے' کا سودا اگر سر پر سوار نہ ہو تو اسلامی حوالے سے مشترکات اور ترجیحات پر اتفاق کوئی مشکل بات نہیں۔

دیکھیے! بڑی سیاسی جماعتوں کے اندر مختلف فکری دائرے اور نظریاتی دھارے ہوتے ہیں (جیسے کہ برصغیر میں کانگرس اور مسلم لیگ میں تھے) اور ان کے درمیان آپس میں اختلاف رائے بھی ہوتا رہتا ہے لیکن اگر اخلاص اور فراست ہو اور بنیادی امور پر اتفاق ہو تو اس کے باوجود جماعت نہیں ٹوٹتی کہ وہ اصل مقصد جس کے لیے جماعت بنی تھی، وہ اختلاف کے باوجود، سب کو عزیز ہوتا ہے۔ یہ وسعت نظری اور اکثرتیت (Pluralism) سیاسی جماعتوں کا حسن ہوتا ہے اور ان کی کامیابی کی ضمانت بھی کیونکہ اس رواداری، اختلاف رائے کو برداشت کرنے اور وسعت فکر و نظر کی وجہ سے قوم کے اکثر طبقے ایک جماعت میں جمع ہو کر اس کی قوت اور کامیابی کا سبب بنتے ہیں۔ اردو کے محسن و قائد اور پنجاب یونیورسٹی کے مایہ ناز استاد ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کہا کرتے تھے کہ اگر مجھے کسی سے ۹۹ فیصد اختلاف ہو اور ایک فیصد اتفاق ہو تو اس ایک فیصد اتفاق کی بناء پر میں اس آدمی کے ساتھ مل کر کام کر سکتا ہوں لیکن ہمارے بعض علماء کرام کا عمومی اسلوب یہ ہے کہ اگر انہیں کسی سے ۹۹ فیصد اتفاق ہو تو وہ اس کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ایک فیصد اختلاف رائے کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ دراصل جماعت اس وقت ٹوٹتی ہے اور نئی جماعت اس وقت بنتی ہے جب ہر آدمی لیڈر بننا چاہے اور شیطان و نفس کی اکساہٹ سے جماعت کے اجتماعی مفاد کو چھوڑ کر اور ایثار و اطاعتِ امیر کا راستہ ترک کر کے خود غرض بن جائے اور حبّ جاہ اس پر غالب آ جائے۔ اور اگر خفیہ ایجنسیاں بھی پشت پناہی کر رہی ہوں تو نور علی نور۔

ہم یقین سے کہتے ہیں کہ پاکستان میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کا مل کر ایک سیاسی جماعت بنانا اور چلانا ممکن ہے اور اس میں بنیادی رکاوٹ اختلاف فکر و نظر نہیں (بلکہ یہ محض بہانہ ہے

اور اسے بطور حیلہ فرنٹ پر رکھا جاتا ہے) اور اصل رکاوٹ عدم اخلاص اور عدم فراست ہے اور اس کے پیچھے حبِّ جاہ و مال اور خفیہ ایجنسیاں ہیں۔

لیکن چلیے جب تک ایسی سیاسی جماعت نہیں بنتی اُس وقت تک اتنا تو ہوسکتا ہے کہ اپنی اپنی جماعت کو باقی رکھتے ہوئے ایک 'متحدہ محاذ' دینی مقاصد کے لیے بنالیا جائے اور مشترکات پر جمع ہوجایا جائے تاکہ اسلام مخالف اور سیکولر قوتوں کے خلاف دینی لوگوں کا ایک ہی پلیٹ فارم ہو۔ اگر ایسا ہوجائے تو اس دینی محاذ کو (جس کا نام کچھ بھی ہوسکتا ہے) عوام کی حمایت حاصل کرنے کے امکانات روشن ہوجائیں گے۔

چلیے! اس سے بھی آگے چلیے! اگر علماء کرام اور دینی عناصر ایک سیاسی جماعت نہیں بنا سکتے، مل کر ایک متحدہ سیاسی محاذ بھی نہیں بنا سکتے تو خدا کے لیے کچھ غیر سیاسی دینی کاموں کے لیے ہی متحد ہوجایئے۔ تعلیم و تربیت، میڈیا اور لوگوں کی اخلاقی تربیت کے لیے متحد ہوجایئے، شرعی عدالتیں قائم کرنے، مسلمانوں کو خودکشیوں سے بچانے اور امن و امان کے لیے ہی متحد ہوجایئے۔ بتایئے! آخر اس میں کیا مانع ہے؟ جب کہ ان غیر سیاسی کاموں کا بالواسطہ فائدہ بھی آپ کی سیاست ہی کو ہوگا۔ ان غیر سیاسی کاموں کی تفصیل ہم نے ذیل میں عوام کی ذہن سازی اور خدمت خلق کے عناوین کے تحت دی ہے

۲۔ عوام کی ذہن سازی کریں

سیاسی کامیابی کے لیے صرف سیاسی سرگرمیاں کافی نہیں بلکہ اس کے لیے وسیع پیمانے پر ذہن سازی اور انسان سازی کی ضرورت ہے کیونکہ دینی سیاسی جماعتوں کی ضرورت صرف اتنی نہیں کہ لوگ انہیں ووٹ دیں بلکہ انہیں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اسلام کی حقانیت کے قائل ہوں، اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا چاہتے ہوں بلکہ پوری زندگی اسلام کے مطابق گزارنا چاہتے ہوں۔ جو نہ صرف خود دین پر عمل کریں بلکہ ان کی خواہش و کوشش ہو کہ دوسرے بھی دین پر عمل کریں۔ ایسے لوگ وسیع پیمانے پر تیار کرنے کی ضرورت ہے بلکہ کوشش ہونی چاہیے کہ سارے مسلمان ایسے ہوں۔ اس کام کے تین بڑے ذرائع ہوسکتے ہیں: ۱۔ تعلیم و تربیت ۲۔ میڈیا؛ اور ۳۔ تعمیر اخلاق

تعلیم و تربیت

پاکستان میں تعلیم و تربیت کا موجودہ ڈھانچہ ناقص اور فرسودہ ہے۔ عمومی تعلیم (جنرل ایجوکیشن) انہی خطوط پر چل رہی ہے جو انگریز نے طے کیے تھے۔ اس کے ردعمل میں دینی مدارس صرف 'مذہبی

تعلیم' دیتے ہیں اور وہ بھی عصری تناظر کے بغیر۔ ان حالات میں تعلیم عام کرنے سے پہلے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔اور یہ بالکل ناگزیر ہے کہ عمومی تعلیم کے نصاب، اساتذہ، تعلیمی انتظامیہ اور طلبہ کی تربیت اور ہم نصابی سرگرمیوں سب کی اسلامی اور عصری تناظر میں تشکیل نو کی جائے اور ان شعبوں میں مغربی فکر وتہذیب کی اندھی تقلید کو رد کر دیا جائے۔ اسی طرح مذہبی تعلیم پر بھی نظر ثانی کی جائے اور مسلک پرستی سے نکل کر اسے مسلم معاشرے اور ریاست کی عصری ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل بنایا جائے۔ثنویت کو ختم کر دیا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تعلیم و تدریس کو تربیت اور کردار سازی کا ذریعہ بنایا جائے۔

اس اصلاح کے بعد تعلیم کو پھیلایا جائے۔ موجودہ نظام تعلیم کی مذکورہ خطوط پر اصلاح کیسے کی جائے اور نئے تعلیمی ادارے کس اسلوب سے کام کریں گے؟ اس پر تحریک اصلاح تعلیم نے تفصیلی کام کیا ہوا ہے جو طبع شدہ موجود ہے، اسے دیکھا جاسکتا ہے۔

میڈیا

اِس وقت پاکستانی میڈیا کی اکثریت مسلم عامۃ الناس اور خصوصاً نوجوانوں کو دین اور دینی تعلیمات و اقدار سے دور کرنے، ان میں فحاشی و عریانی پھیلانے اور رقص و سرود عام کرنے میں مصروف ہے اور یہی امریکہ و یورپ اور بھارت کا ایجنڈا ہے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے دو طریقے ہیں: ایک تو یہ کہ موجودہ میڈیا کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔حکومت کو اس کے فرائض منصبی یاد کرائے جائیں کہ وہ میڈیا کی کڑی نگرانی کرے اور اس کا قبلہ ٹیڑھا نہ ہونے دے۔ علاوہ ازیں رائے عامہ بیدار کی جائے، میڈیا مالکان اور مینجر سے ملا جائے اور غلط پروگراموں پر احتجاج کیا جائے دوسرے یہ کہ درد رکھنے والے اسلامی عناصر میڈیا میں صحیح خطوط پر کام کرنے کے لیے خود ایسے ٹی وی چینل اور متبادل پروگرام تیار کریں جو صحیح رُخ میں عوام کی ذہن سازی کریں اور انہیں اسلامی اصول و اقدار پر عمل کے لیے اکسائیں۔

تعمیر اخلاق

فرد اور معاشرے کی بقاء، ترقی اور وقار کا انحصار اس کے اخلاق پر ہوتا ہے اور اخلاقی زبوں حالی لازماً زوال پر منتج ہوتی ہے۔ لہٰذا تعلیم اور میڈیا کے علاوہ سماجی اور عوامی سطح پر بھی تعمیر اخلاق کے لیے کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر محلے کی سطح پر ایک تعمیر اخلاق کمیٹی بنائی

جائے جو محلے کے معززین اور نمازیوں پر مشتمل ہو۔ یہ کمیٹی عام لوگوں خصوصاً نوجوانوں کے لیے تعمیری مصروفیات پیدا کرے اور پارکوں میں کھیل کود، اِن ڈور گیمز، لائبریری، درسِ قرآن کے حلقے، تقریروں اور نعتوں کے مقابلے جیسی سرگرمیوں کا اہتمام کرے۔ نیز محلے میں غیر اخلاقی سرگرمیوں کا سد باب کرے جیسے پارکوں میں منشیات کا استعمال، نیٹ کیفے میں غیر تعمیری سرگرمیاں، گلی کی نکڑ پر نوجوانوں کا اجتماع، ون وہیلنگ وغیرہ۔

۳۔ خدمت خلق

بگڑے ہوئے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی ماحول میں لوگوں کی مشکلات ومسائل میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اِن حالات میں ناگزیر ہے کہ لوگوں کے دکھ اور تکلیف کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ علماء کرام اور دینی عناصر چونکہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ اس کام کی دینی اہمیت کیا ہے لہٰذا انہیں تو ضرور ہی خدمت خلق کے یہ کام کرنے چاہئیں۔ ہم نے بطورِ مثال تین شعبوں کا انتخاب کیا ہے: غربت میں کمی، فراہمیٔ انصاف اور بحالیٔ امن وامان۔

غربت کا خاتمہ

ہمارے معاشرے کے افلاس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے ہمیں وسائل سے نہیں نوازا۔ نہیں! اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت وسائل سے نوازا ہے لیکن ہماری نالائقی یہ ہے کہ ہم ایسی قیادت سامنے نہیں لاسکے جو ان وسائل کا صحیح استعمال کرتی۔ اس کے برعکس ہماری قیادت ایسی ہے جو اسلام دشمن مغربی طاقتوں اور یہودیوں کی معاشی چالوں کو نہیں سمجھتی اور ان کا توڑ نہیں کرتی بلکہ ان کے مہرے کے طور پر کام کرتی ہے، ان کے مقاصد پورے کرنے میں ان کی معاونت کرتی ہے اور قومی خزانے کو ذاتی خزانہ سمجھ کر استعمال کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ امت افلاس کا شکار ہے، لوگ نانِ جویں کے محتاج ہیں اور خودکشیاں کر رہے ہیں۔ اس کا دیرپا حل تو یہ ہے کہ اسلامی تناظر میں صحیح معاشی پالیسیاں وضع کرکے ان پر عمل کیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ غربت کی چکی میں پستے ہوئے عوام کی اتنی دستگیری بہرحال ضروری ہے کہ جس سے وہ خودکشیوں سے بچ سکیں۔ ہم ابتداء میں اس کے لیے عوامی سطح کے دو ایسے اقدامات تجویز کرتے ہیں جن پر حکومتی اعانت کے بغیر پرائیویٹ سیکٹر اور معاشرہ کے افراد عمل کرسکتے ہیں۔ اس تجربے کی کامیابی کے بعد مزید اقدامات پر عمل کا سوچا جاسکتا ہے۔

ان میں سے ایک ہے: قومی سطح کی ایک ایسی مرکزی زکوٰۃ کونسل کا قیام جس کے ارکان میں ایسے لوگ شامل ہوں جن کی امانت ودیانت پر قوم کو اعتماد ہو۔ سارے ملک سے زکوٰۃ وصدقات کے پیسے اس

کونسل میں جمع ہوں اور وہ اسے غربت کے خاتمے کے لیے استعمال کرے۔ دوسرے ہر محلہ کی سطح پر ایسی کمیٹی کا قیام جو محلے کے یتیموں، بیواؤں اور مساکین کی فہرست تیار کرے اوران کی اتنی مالی مدد کرے جس سے ان کے رزق کفاف کا انتظام ہوجائے اور وہ عزت سے گزر بسر کرسکیں۔ محلے کے کھاتے پیتے لوگ مل کر اس کمیٹی کو اتنے وسائل فراہم کریں جن سے یہ ضرورت پوری ہوجائے اور اکثر و بیشتر معاملات میں ایسا ہوسکتا ہے۔ استثنائی حالات میں مذکورہ مرکزی زکوٰۃ کونسل سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

فراہمیٔ انصاف

مغرب کی نقالی اور اس کے نظام قانون کو مسلم معاشرے میں نافذ کرنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگ انصاف سے محروم ہوگئے ہیں۔ انصاف مہنگا ہوگیا ہے اور یہ بکتا ہے جسے ہر آدمی خرید نہیں سکتا۔ نیز یہ جلدی نہیں ملتا خصوصاً ہماری دیوانی عدالتیں تو آدمی کو دیوانہ اور دیوالیہ بنادیتی ہیں اور ایک نسل کے مقدمہ کا فیصلہ بعض اوقات دوسری نسل سنتی ہے۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں کورٹ فیس، وکیلوں کے خرچے، مغرب کے عدالتی نظام سے مستنبط عدالتی پروسیجرز، عدالتی عملے کی کمی، رشوت ستانی۔۔۔وغیرہ۔ اصل ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان مسائل کا حل اسلامی تناظر میں سوچا جائے اور اس پر عمل کیا جائے اور یہ تبھی ہوگا جب ایسی سیاسی قیادت برسر اقتدار آئے جو یہ کام کرنا چاہے۔ لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا پرائیویٹ سیکٹر اور عام سوسائٹی خصوصاً علماء کرام یہ تو کرسکتے ہیں کہ پاکستانی آئین وقانون عدالت سے باہر جن مصالحتی وثالثی اقدامات کی اجازت دیتے ہیں، انہیں منظم کرلیا جائے اور گاؤں وشہر کی سطح پر ایسی مصالحتی وثالثی عدالتیں بنائی جائیں جن میں ایک عالم دین، ایک متدین وکیل اور ایک معزز تجربہ کار شہری شامل ہو۔ اس عدالت کو شرعی عدالت یا قاضی کورٹس بھی کہا جاسکتا ہے اور ان کے لیے اصول وضوابط بھی وضع کیے جاسکتے ہیں۔

بحالیٔ امن وامان

ہمارے معاشرے میں امن وسکون نہ ہونے کی وجہ اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنا ہے خصوصاً ظلم و زیادتی، بددیانتی، انصاف کا نہ ملنا، بھوک اور غربت، کرپشن۔۔۔وغیرہ اس کے بڑے اسباب ہیں۔ ان سب کا بھی سدّ باب ہونا چاہیے اور اس کے لیے سیاسی واجتماعی تبدیلی کے لیے جدوجہد بھی ضروری ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ کچھ براہ راست کوششیں بھی حالات سدھارنے یا امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پانے کے لیے کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہوسکتی ہے کہ محلے

کی سطح پر ایک 'امن کمیٹی' بنالی جائے جو نوجوانوں کو متحرک کرے اور ہر گلی سے کچھ نوجوان ایسے نکل آئیں جو اپنی گلی میں باری باری رات کو پہرہ دیں اور دن میں بھی امن وسلامتی کا خیال رکھیں۔ اجتماعیت میں بڑی برکت ہوتی ہے اور اگر اس کام کو منظم کرلیا جائے تو اس پر کوئی خرچ آئے گا اور نہ کسی کا زیادہ وقت لگے گا۔ چوریوں اور سٹریٹ کرائمز پر اس طرح قابو پانے میں بہت مدد ملے گی۔اہل محلہ وگلی میں تعاون کی فضا ہو تو مل کر تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے چوکیدار بھی رکھا جاسکتا ہے۔

یہ کام کیسے ہوسکتے ہیں؟

ہم نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ پاکستان میں نہ تو صحیح اسلامی معاشرہ قائم ہوسکتا ہے اور نہ اسے مثالی اسلامی ریاست بنایا جاسکتا ہے جب تک علماء کرام اور دینی سیاسی عناصر متحد نہ ہوں اور اگر اخلاص اور فراست دونوں موجود ہوں تو یہ اتحاد آسانی سے معرض وجود میں آسکتا ہے۔ اب ہم اس سے آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ چلیے پہلے مرحلے پر اگر آپ کا 'سیاسی اتحاد' آسانی سے نہیں بن سکتا تو اِن غیر سیاسی لیکن اہم دینی کاموں کو مل کر کرنے ہی پر اتفاق واتحاد کر لیجیے۔ یہ بھی بہت باعث برکت ہوگا۔اور بدرجۂ آخر اگر آپ یہ دینی کام بھی مل کر نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا ہی کیجیے کہ آپ خود یعنی اپنی جماعت کی پوری قوت سے یہ کام کرنا شروع کر دیجیے۔

اس منہاج کی افادیت

موجودہ دینی سیاسی جماعتوں کے افراد یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اِس نئے منہاج کو آخر کیوں اختیار کیا جائے اور اپنی قوت ان غیر سیاسی کاموں میں کیوں لگائی جائے اور ان کی افادیت کیا ہے؟ ہم عرض کرتے ہیں کہ:

۱۔ آپ غور فرمائیں کہ آپ اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کیوں قائم کرنا چاہتے ہیں؟ اِس کا جواب اِس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ چاہتے ہیں کہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دین پر عمل کرنے لگیں۔ اب اگر مسلمان حکومت عوام کو ایسا کرنے میں مدد نہیں دیتی تو سوال یہ ہے کہ اتنا اہم کام صرف حکومت پر کیوں چھوڑا جائے کہ اگر وہ صحیح سمت میں متحرک نہ ہو تو یہ کام ہی فوت ہوجائے۔حکومت کو یہ کام کرنے چاہئیں لیکن اگر وہ نہیں کرتی تو کیا دینی قیادت کو بھی یہ کام نہیں کرنے چاہئیں؟ آخر اس میں مانع کیا ہے؟

۲۔ اگر آپ یہ کام کرتے ہیں تو آدھی سے زیادہ شریعت تو بلاشبہ نافذ ہوجائے گی اور باقی آدھی کی

آپ بنیاد رکھ دیں گے اور اقتدار ملنے پر اس میں رنگ بھر سکیں گے۔

۳۔ عوام میں آپ کی قیادت پر اعتماد پیدا ہوگا اور وہ سوچیں گے کہ جو لوگ بغیر اقتدار میں آئے ان کی خدمت کررہے ہیں اور ان کے مسائل حل کرنے کی تگ و دو کررہے ہیں، وہ کل اقتدار میں آکر ان کے مسائل کیوں حل نہ کریں گے؟

۴۔ تجربے نے یہ بتایا ہے کہ محض قانون بنادینے سے کام نہیں بنتا اور نہ لوگ صرف قانون بن جانے کی وجہ سے دینی احکام پر عمل کرنے لگتے ہیں تو لامحالہ آپ کو اس کا کوئی متبادل سوچنا چاہیے کہ لوگ کیسے دین کے احکام پر عمل کریں؟ اور متبادل یہی ہے کہ آپ لوگوں کی صحیح تعلیم وتربیت سے ان کے اندر یہ سپرٹ اور جذبہ پیدا کریں کہ وہ خود اپنے اندر کی تحریک سے اور اپنی ایمانی قوت سے دینی احکام پر عمل کریں۔

۵۔ اسلامی قوانین بنادینے کے باوجود ان پر عمل کیوں نہیں ہوتا؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ حکومت کی انتظامی مشینری یعنی پولیس، عدلیہ، جج، وکیل، اور انتظامی عملہ خود اسلامی احکام پر عمل نہیں کرنا چاہتا کیونکہ انہیں 'دنیاوی' ترجیحات و مقاصد نے ورغلا رکھا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس انتظامی مشینری کی، جو مسلمانوں ہی پر مشتمل ہے، اصلاح کیسے ہوگی؟ آپ کہیں گے ان کی اصلاح حکومت کرے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حکومت نہ کرے تو پھر؟ آپ اس بات کو جتنا چاہے کھینچتے اور گھماتے چلے جائیں آپ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جب تک آدمی کی اصلاح نہ کی جائے اور فرد کو نہ بدلا جائے، کوئی نتیجہ خیز اجتماعی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اور فرد کی اصلاح کا نسخہ وہی ہے جو ہمارا مجوزہ منہاج مہیا کرتا ہے یعنی صحیح تعلیم وتربیت، میڈیا کا درست استعمال اور اخلاقی تربیت۔ ہم کہتے ہیں کہ قانون کی طاقت اور ڈنڈے کے زور سے انسانوں کے دل و دماغ نہیں بدلے جاسکتے۔ قانون کی طاقت تو محض اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی روکنے کا آلہ ہوتی ہے یہ تو محض علاجیاتی اقدام (Remedial measure) ہوتی ہے، یہ انسانوں میں وہ بنیادی تحریک پیدا ہی نہیں کرتی، کر ہی نہیں سکتی جو انسان کو عمل پر اکساتی اور ابھارتی ہے۔

۶۔ انسانی تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ 'ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد'۔ یعنی مخدوم بننا ہے تو لوگوں کی خدمت کرو۔ اور خدمت کے لیے حکومت اور اقتدار شرط نہیں۔ کس نے آپ کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے کہ آپ لوگوں کے دکھ درد دور کرنے کی کوشش نہ کریں؟ بلکہ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آج ان سیاسی قائدین

کے پاس اقتدار نہیں اور یہ پھر بھی لوگوں کے دکھ درد میں کام نہیں آتے تو کل اقتدار میں آ کر کیا کریں گے جب ان کا دماغ حکومت و اقتدار کی وجہ سے مزید اونچا اڑنے لگے گا اور یہ فخر و غرور کی وجہ سے لوگوں کی خدمت کو عار سمجھنے لگیں گے؟ اس اصول پر عمل کی بہترین مثال مسلم صوفیا ہیں جن کے منہج کا لازمی حصہ خدمت خلق تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ عوام میں اتنے مقبول ہوتے تھے کہ نیک حکمران ان پر رشک کرتے اور ان کی اطاعت کرتے تھے اور دنیادار حکمران تبھی ان کا ادب اور تکریم کرتے تھے۔

۷۔ ہمارے دیکھتے الجزائر اور ترکی بلکہ ملائشیا میں جو تبدیلی آئی ہے وہ اصلاح فرد اور خدمت کے اسی منہج کی بنیاد پر آئی ہے کیونکہ حقیقی اور پائیدار تبدیلی وہی ہوتی ہے جو افراد معاشرہ کی مرضی سے آئے اور افراد معاشرہ کو جیتنے کے دو ہی تیر بہدف طریقے ہیں: ایک ان کے دل و دماغ کو اپنی موافقت میں بدلنا اور دوسرے خدمت خلق۔

۸۔ یہ منہاج یعنی اسلامی معاشرے و ریاست کا قیام بذریعہ سماجی تبدیلی محض ایک سیاسی حکمت عملی اور ووٹروں کے دل جیتنے کا طریقہ نہیں بلکہ ذرا غور کریں گے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ شرعی تقاضا ہے۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو کام کا جو طریقہ بتایا تھا وہ دعوت و اصلاح بذریعہ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیے کا تھا۔ اصلاح اخلاق کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے مال میں غریبوں کا حق ہے۔ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم مومن نہیں ہو اگر تمہارا ہمسایہ بھوکا ہو اور تم پیٹ بھر کر سوؤ۔ یہ بھی فرمایا کہ راستے سے کانٹا ہٹانا بھی صدقہ ہے یہ بھی فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ تو گویا اصلاح و خدمت کا منہاج ایک شرعی تقاضا ہے جس پر عمل کرنے کے سارے مسلمان مکلف ہیں۔ ہم نے اسے صرف منظم صورت میں پیش کیا ہے۔

۹۔ ان غیر سیاسی کاموں کے ذریعے آنے والی سماجی تبدیلی کے اثرات پائیدار ہوں گے جبکہ سیاسی تبدیلی کے اثرات بعض اوقات پائیدار نہیں ہوتے اور نہ ان میں تسلسل ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ عوام کسی دینی سیاسی جماعت کو ایک دفعہ ووٹ دے کر اقتدار میں لائیں اور کسی وجہ سے اگلی دفعہ اسے ووٹ نہ دیں تو اس دینی سیاسی جماعت کے کاموں کا تسلسل باقی نہ رہ سکے گا۔

۱۰۔ ان غیر سیاسی دینی کاموں کا آخری فائدہ دینی سیاسی جماعتوں کو ہوگا کیونکہ جو علماء کرام دعوت و

تبلیغ، اصلاح وتربیت اور خدمت خلق کے کاموں میں مصروف ہوں گے، انہوں نے لوگوں سے نہ ووٹ لینے ہیں نہ کوئی اجر مانگنا ہے لہٰذا یہ کام اگرچہ غیر سیاسی ہیں لیکن ان کا سیاسی فائدہ بہرحال دینی

> بعض جدید اسلامی مفکرین بندگی اور فرائض دینی کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دین کا مطلوب حقیقی اطاعت رب ہے جہاں تک نماز روزہ جیسی عبادات کا تعلق ہے تو یہ اس اصل کام میں معاونت کرتی ہیں۔ اس کے برعکس اہل تزکیہ کہتے ہیں کہ اصل چیز عبادت (بمعنی پرستش) ہے اور اطاعت محض اس کا ایک ثمر۔
> قرآن وسنت میں اس کے لیے 'عبودیت' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں عبادت (پرستش) اور اطاعت دونوں بیک وقت شامل ہوتے ہیں اور دونوں ہی اہم ہیں۔ بہرحال اس تحریر میں احمد جاوید صاحب نے عبادت (بمعنی پرستش) کی اہمیت بیان کی ہے اور اس کے اہم تر ہونے پر اصرار کیا ہے۔ امین

سیاسی جماعتوں کو ہوگا جیسا کہ ترکی میں ہوا ہے کہ فتح اللہ گولن کی تعلیمی تحریک کا فائدہ موجودہ حکمران جسٹس پارٹی کو ہوا ہے اور اس کا ووٹ بنک بڑھا ہے۔

۱۱۔ اس سے دین کے اس تجریدی تصور کی نفی ہوگی جس میں sofistication تو نظر آتی ہے لیکن عملی زندگی کے مسائل سے اس کا تعلق نمایاں ہوکر سامنے نہیں آتا اور عوام کو اسے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے جیسے آئین کو اسلامی بنانے کی جدوجہد، اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام، نفاذ حدود کا اعلان وغیرہ۔ حالانکہ شریعت تو لوگوں کے عملی مسائل کے حل ہی کے لیے اللہ نے نازل فرمائی تھی۔ ہمارے اس مجوزہ منہاج میں تعلیم، میڈیا، تعمیر اخلاق، فراہمیٔ عدل وانصاف، بحالیٔ امن وامان اور غربت میں کمی کے اقدامات ایسے ہیں جن سے لوگوں کے مسائل حل ہوں گے اور انہیں شریعت اپنی زندگی میں عملی کردار ادا کرتی اور مسائل حل کرتی نظر آئے گی۔

۱۲۔ تعمیر اخلاق کمیٹی، امن وامان کمیٹی، فراہمیٔ عدل کمیٹی، غریبوں کی مدد کرنے والی مالیاتی کمیٹیاں اگر گلی محلہ کی سطح پر بنائی ہوں تو اس کا بہترین فورم مسجد ہے جہاں محلہ کے شرفاء پانچ وقت نماز کے لیے باجماعت جمع ہوتے ہیں۔ یہی نمازی ان کمیٹیوں کے موزوں ممبر ہوسکتے ہیں اور ان کے اجلاس مسجد ہی میں رکھے جاسکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف مسجد کے اس کردار کا احیاء ہوگا جو عہد نبوی میں تھا بلکہ اس سے مسجد کی مرکزیت معاشرتی ڈھانچے کو اسلامی بنانے میں اہم کردار ادا کرنے لگے گی۔

تزکیۂ نفس

احمد جاوید

عبادت، اطاعت سے اہم تر ہے

س: دین میں عبادات کا کیا مقام ہے؟

ج: ہماری حقیقت، جو ہمیں کسی اور نے نہیں بلکہ ہمارے خالق نے بتائی ہے، عبدیت ہے۔ ایمان اس حقیقت کا شعور ہے اور عبادت اس کا عملی اظہار۔ پوری انسانیت یعنی انسان ہونے کے تمام معانی ان قطبین کے بیچ میں ہیں۔ ہمارا انسان ہونا جو بھی حقیقت رکھتا ہے وہ اپنے تصور اور احساس سمیت ہماری عبودیت میں مندرج ہے۔ ایمان اس حقیقت کو بتمام وکمال ہمارے شعور اور شعور سے پیدا ہونے والے ارادے میں لے آتا ہے اور عبادت حقیقت کے اس کمال سے اپنے آپ کو ہم آہنگ اور موافق رکھنے کا وہ نظام ہے جسے نظر انداز کر کے شعور میں موجود کسی یقین یا تصور کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہاں ایک نزاکت ضرور ملحوظ رہنی چاہیے کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف کے ہاں ایمان وعمل کی عینیت یا غیریت کے جو مباحث پیدا ہوئے تھے ان کا ایمان اور عبودیت کی نسبت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایمان عمل سے چاہے عینیت نہ رکھے لیکن نفس عبودیت کے ساتھ اس کا یکجان ہونا اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر ایمان کے کوئی معنی نہیں رہتے لہٰذا عبودیت کے اولیں عملی اظہار یعنی عبادت کو اس معنی میں محض عمل نہیں سمجھنا چاہیے جس کو مراد لے کر بعض ائمہ ایمان کے ثبوت کے لیے اسے لازمی حیثیت نہیں دیتے۔ اس نکتہ کو یوں سمجھیں کہ ایمان ہو یا عمل دونوں فرعیں ہیں، ان کی اصل عبودیت ہے یعنی حقیقت انسانی۔ عبودیت کا عرفان و اقرار شعور میں ہو تو ایمان ہے اور عمل میں آ جائے تو عبادت ہے۔ اس لئے ہمارا اصرار ہے کہ بے عملی کے باوجود ایمان کا ثابت ہو جانا اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ عبودیت بھی مرتبۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔

عبادت شرعی اصطلاحی مفہوم میں محض عمل نہیں ہے یہ ایمان کا لازمی اظہار اور بندگی کا ویسا ہی ضروری تقاضا ہے جیسا کہ خود ایمان۔ عبادت میں نقص ایمان میں بھی وارد ہوتا ہے یا ایمان ہی کی خرابی کا ظہور ہوتا ہے۔ ایمان وعمل کی بحثیں جس زمانے میں پیدا ہوئی تھیں اس وقت اور اس ماحول میں عمل کو عبادت پر محیط جاننے کا کوئی مضبوط قرینہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہمارے حالات یکسر مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں نقص عمل سب سے پہلے نقص عبادت میں ظہور کرتا ہے جبکہ پچھلے مسلم معاشروں میں یہ بات نہیں تھی۔ ہماری رائے میں مسلمانوں کی موجودہ حالت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس چیز کو بالکل واضح کر دیا جائے کہ ترک عبادت گویا انکارِ اسلام ہے۔ ممکن ہے کہ دیگر عملی کوتاہیاں دین کہ نا قابل تلافی نقصان نہ پہنچائیں مگر انتظام عبادات کے بغیر کسی فرد اور کسی معاشرے کا مسلمان کہلانا بے معنی ہے بلکہ بدترین فریب دہی ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عمل کی خرابیوں یعنی گناہوں کی باعتبار اصل دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس سے اللہ کی ذات کا انکار متبادر ہوتا ہے چاہے اس کا اعلان نہ کیا جائے اور دوسری نوع میں اللہ کے احکام پر عمل نہ کر سکنا ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی قسم منافیٔ اسلام و ایمان ہے اور ترک عبادت کا

تعلق اسی قسم سے ہے۔ دوسری قسم کی خرابیاں البتہ مسلمان اور مومن ہونے کے دعوے کو باطل نہیں کرتیں۔ یہ بے عملی یا بدعملی کی وہ قبیل ہے جو نفس ایمان کے ساتھ لازمی عینیت نہیں رکھتی۔

کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ معروف عبادات اللہ کے احکام ہی تو ہیں لہٰذا ان عبادات سے غفلت کو گناہ کی دوسری قسم یعنی حکم کی تعمیل سے قاصر رہ جانے پر کیوں معمول نہیں کیا جا سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خود احکام الٰہیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکم خود ذات باری تعالیٰ کے حقوق کو ادا کرنے کے لئے اور دوسرا اپنے نفس یا دیگر حقوق کی پاسداری کے لئے۔ اس طرح سے دیکھیں تو ترک عبادت اللہ کے ذاتی حقوق میں سے سرفہرست حق یعنی معبودیت کی ادائی سے روگردانی ہے۔ اس میں انسانی نفسیات کی تمام مسلمات کی تائید کے ساتھ خدا کے انکار کا پہلو غالب ہے۔

اس مسئلے پر غور کرنے سے ایک بات اور سامنے آتی ہے کہ عبادت دو مفاہیم رکھتی ہے: پرستش اور اطاعت۔ ہم نے اوپر پرستش کو موضوع بنایا ہے ورنہ اللہ کے ہر حکم کی تعمیل عبادت ہی ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پرستش میں کوتاہی ایمان کی خرابی ہے اور اطاعت میں نقص مسلمانی کا نقص ہے۔ ہر آدمی فطری طور پر یہ محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ ایمان اور پرستش نفس عبودیت میں ہم معنی ہیں لہٰذا پرستش کو یعنی معروف عبادات کو بندگی کے ان مظاہر سے جو اطاعت پر دلالت کرتے ہیں، ممتاز رکھنا چاہئے ورنہ بعض ضروری مسائل لاینحل رہ جائیں گے۔

س: پرستش اور اطاعت میں کیا فرق ہے؟

ج: اگر اللہ کی جہت سے دیکھیں گے تو دونوں میں مرتبے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ کا معبود ہونا وہی شان رکھتا ہے جو اللہ کے حاکم ہونے میں موجود ہے۔ البتہ انسانی پہلو سے دیکھیں گے تو انسان کے باطنی تجزیے کے مطابق ان میں خاصا فرق ہے۔ یہ فرق درجات کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ایک بنیادی انسانی استعداد سے ہے۔ وہ استعداد تعلق کی استعداد ہے۔ انسان کی تمام صلاحیتوں کو منہا کرتے چلے جائیں تو آخر میں جو صلاحیت باقی بچے گی وہی تعلق کی صلاحیت ہوگی۔ علم ہو یا اختیار ہر وصف اسی جوہر تعلق کے اقتضاء کی تکمیل کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان جو ہر تعلق کا نام ہے اور اس کا عالم، خودمختار، ناطق ۔۔۔ وغیرہ ہونا اسی جوہر کی نمود ہے۔ یہ اولیں استعداد جو کسی اور صلاحیت کا نتیجہ نہیں ہے، پرستش پر قائم ہے کیونکہ پرستش کی مناسبت اس سے زیادہ ہے۔

اس کی ضروری تفصیل یہ ہے کہ انسان کے باطنی حقائق پر غور کرنے والا کوئی بھی شخص نہایت آسانی اور تقریباً قطعیت کے ساتھ دریافت کر سکتا ہے کہ اپنی اصلی ماہیت میں نفس انسان کا اولین مطالبہ حصول تسکین یا حصول اطمینان ہے اور اس کے متوازی ثانوی تقاضا بقائے دوام ہے یعنی نفس

انسانی کے بنیادی تقاضوں کو ایک تاریخی ترتیب سے دیکھا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ یہ پہلے تسکین چاہتا ہے اور پھر دوام۔ حصول تسکین کی بنیاد ظاہر ہے کہ براہ راست اس تعلق سے ہے جو انسان کی حقیقت ہے جب کہ خواہش بقا کو یہ نسبت بالواسطہ حاصل ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں سمجھیے کہ بندہ اللہ سے تعلق کو پہلے سرچشمۂ اطمینان بناتا ہے اور پھر اپنی جانثاری اور اخلاص دکھا کر اس سے کچھ امیدیں باندھتا ہے۔ اطمینان پیدا کرنے والے ذرائع بھی اللہ عطا فرماتا ہے اور امیدیں باندھنے والا مواد بھی وہی عنایت کرتا ہے۔ دین کا پورا نظام عبادت پہلی قبیل سے ہے اور نظام اطاعت دوسری سے۔ عابد مطمئن ہوتا ہے اور مطیع پر امید۔ گویا عبادت بندگی کے جوہر کو تسکین کے منتہیٰ تک پہنچاتی ہے اور اطاعت اس جوہر کو امید کے منتہیٰ تک۔ عبادت سے تسکین پانا تو واضح ہے کہ اس میں اللہ کی ذات کا سامنا یکسوئی کے ساتھ اور واسطوں کی کثرت کے بغیر میسر آتا ہے جبکہ اطاعت میں عبادت والی یکسوئی اور واسطوں کی کثرت کے نہ ہونے کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ یہ معاذ اللہ اطاعت کا کوئی نقص نہیں بیان کیا جارہا بلکہ انسان کی حقیقی بناوٹ کے اندر رہتے ہوئے عبادت اوراطاعت کی اس حد رسائی کو دیکھنے کی کوشش کی جارہی ہے جو یہ دونوں نفس انسان میں رکھتے ہیں۔

توخیر ذکر یہ ہو رہا تھا کہ بندگی جس اخلاص سے عبارت ہے باعتبار ترتیب اس کی تشکیل کا عمل عبادت میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد تکمیل کے مراحل اطاعت سے طے ہوتے ہیں۔ اس لئے ذوق بندگی جو دراصل کمال بندگی پر دلالت کرتا ہے تسکین عبادت سے پاتا ہے اور تکمیل اطاعت سے۔ غرض جس طرح بھی دیکھیں فطرت انسانی کا اولیں داعیہ عبادت ہے اور خود عبادت کے قیام کی واحد بنیاد اطاعت ہے۔ تو یہ کہنا کہ اطاعت کل ہے اور پرستش اس کا جزو، الٹی بات ہے۔ صحیح صورت تو یہ ہے کہ پرستش کل ہے اور اطاعت اس کا جزو کیونکہ پرستش روح تعلق ہے اور اطاعت صورت تعلق۔ اسی لئے ہم باصرار کہتے ہیں کہ ذوق عبادت کے بغیر اطاعت کا ظاہری نظام ایک مکمل اور خوبصورت جسد ہے مگر بے روح۔ اس میں اخلاص تو موجود ہوسکتا ہے مگر کمال اخلاص کا حصول اس وقت تک محال ہے جب تک ذوق عبادت ہر دوسری چیز پر غلبہ نہ رکھتا ہو۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ مقتضائے اطاعت سے اس ذوق عبادت پر عمل کو کم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک دوسرا موضوع ہے لیکن بہتر ہے کہ یہیں واضح کر دیا جائے کہ انسان کی دینی ذمہ داریوں کا تعین بنیادی طور پر اطاعت سے ہوتا ہے ذوق عبادت سے نہیں۔ ہمیں کن حالات میں کیا کرنا چاہیے اس کا فیصلہ ذوق پرستش پر نہیں چھوڑا جا سکتا ورنہ شریعت کے تمام مقاصد درہم برہم ہو سکتے ہیں۔ اس فیصلے کا دار ومدار فرائض کے اس نظام پر ہے جو شریعت یعنی ظاہر احکام کی دین ہے اور اس سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے جو قوت درکار ہے، وہ قوت اطاعت ہے۔ ہمارا خیال

ہے کہ اب پوری بات کسی افراط وتفریط کے بغیر متوازن انداز میں سامنے آ گئی ہوگی اور اصولاً یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ ذوق پرستش کا نقص ایمانی نقص ہے جب کہ جذبۂ اطاعت کی خرابی عملی خرابی ہے۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ یہاں بات خرابی کی ہو رہی ہے فقدان کی نہیں۔ خرابی کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو بہر حال جزوی ہوتی ہے۔

ان باتوں پر قرآن وسنت سے متعدد اسناد لائی جاسکتی ہیں۔ وہ ان شاء اللہ آئیں گی بھی لیکن تمہید کے طور پر سر دست مندرجہ ذیل نکات کو موضوع فکر بنائیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ انسان کے جتنے مطلوبہ خصائص بیان کرتا ہے ان میں بیک وقت دو پہلو موجود ہوتے ہیں۔ گفتگو میں سہولت کے لئے ایک کو داخلی یا اصولی پہلو کہہ لیں اور دوسرے کو خارجی یا عملی۔ ان میں سے کوئی ایک بھی منہا نہیں ہوسکتا تاہم قاعدے کے مطابق تقدم اور کلیت اصولی یا داخلی پہلو کو حاصل ہوگی۔ مثال کے طور پر کچھ ضروری اوصاف کا تجزیہ کیجیے جیسے تقویٰ، اخلاص، خشیت، محبت، توکل، ذکر، حمد، صبر، تسلیم و رضا۔۔۔وغیرہ۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی کھنگال کر دیکھ لیں۔ اس کا قیام جس بنیاد پر ہوگا وہ پرستش ہی ہے، اظہار البتہ اطاعت پر مبنی ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم اس طرح کا تجزیہ بھی موقع بہ موقع کریں گے۔ فی الوقت دو باتیں سمجھ لینی ضروری ہیں: پہلی یہ کہ اطاعت میں جبر کا عنصر مکمل طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا تا وقتیکہ ذوق پرستش اس کی پشت پر نہ ہو۔ دوسری یہ کہ اللہ کے ساتھ تعلق میں اخلاص اس آمادگی کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا جو جبر کی ضد ہے اور جذبۂ پرستش کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ بالکل عملی انداز سے دیکھا جائے تو ایک معمولی استعداد والا ذہن بھی اس نکتے کو گرفت میں لے سکتا ہے کہ اللہ کے لئے کیا جانے والا کوئی بھی عمل داعیۂ پرستش کے بغیر محض ایک تکلف ہے بلکہ ایک دھوکہ ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک شخص دین کو ساری دنیا پر غالب کرنا چاہتا ہے مگر خود اس کا یہ حال ہے کہ نماز میں دل نہیں لگتا، اللہ کی یاد سے بھاگتا ہے، ذکر و تلاوت کی طرف کوئی رغبت نہیں رکھتا۔ اس شخص کے جذبات خواہ کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، دینی معیار سے بے بنیاد ہیں۔ غلبۂ دین کی جدوجہد وغیرہ اس کا کوئی نفسیاتی مسئلہ تو ہوگا مگر اس کی کوئی دینی وقعت نہیں ہے۔ جو بندہ پوری آمادگی کے ساتھ دین کو اپنے اوپر غالب آنے کا موقعہ نہیں دیتا یعنی ذوق پرستش کو پروان نہیں چڑھاتا وہ دین میں درکار ہر کامیابی حاصل کرسکتا ہے مگر بندگی کی اس کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا جس پر آخرت کا دارومدار ہے۔ تعجب ہے کہ آدمی اتنی واضح بات کو قبول کرنے سے ہچکچائے کہ بندگی اللہ سے سچے تعلق کا نام ہے اور یہ تعلق پرستش سے اولیں فطری مناسبت رکھتا ہے۔

بات محض یکطرفہ ہو کر نہ رہ جائے اس لئے یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ وہ شخص بھی دین کا صحیح نمائندہ نہیں ہے جو نوافل و اذکار میں تو پوری قوت اور رغبت سے مشغول رہتا ہے لیکن اخلاق و معاملات اور دین کی طرف سے عائد کردہ دنیاوی ذمہ داری سے غافل ہے۔ اس کی عبادت گزاری بھی محض ایک دھوکہ ہے کیونکہ اس نے تعلق باللہ کے تمام تقاضوں کو نہیں نبھایا اور اپنی طبیعت اور خواہش کی رہنمائی میں کچھ کو قبول کرلیا اور باقی کو چھوڑ دیا۔ ڈر ہے کہ یہ آدمی پہلے شخص کے مقابلے میں زیادہ بڑے خطرے میں مبتلا ہے کیونکہ اس نے اللہ کے آگے اپنی مرضی چلائی ہے۔ پہلا آدمی تو اصولاً ایک نقص پر کھڑا ہے جبکہ یہ مجرمانہ غفلت اور سرکشی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ہاں! اگر اطاعت پہ زور دینے والا ترک عبادت کی طرف مائل ہو تو پھر یہ گویا دین ہی کا انکار ہے لیکن ظاہر ہے ایسا ہے نہیں۔

دین کی مراد پر ڈھلنے کے لئے تین مراتب یکے بعد دیگرے حاصل کرنے پڑتے ہیں:

۱۔ پرستش میں کمال ۲۔اطاعت میں رسوخ ۳۔اللہ کی مکمل غلامی

پہلے دو مراتب راستے کی طرح ہیں اور تیسرا مرتبہ منزل کی طرح۔ دوسرے لفظوں میں مطلوب یہ ہے کہ بندہ اللہ کی مکمل غلامی میں چلا جائے اور یہ غلامی اس کے لئے محبوب ترین اعزاز ہو جس پر وہ فخر کر سکے۔ یہاں سے دیکھیں تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ بندہ بمعنی غلام اپنی بندگی کو اس وقت تک محکم اور کامل نہیں کر سکتا جب تک اس کا مالک اس کے لئے محبت اور خشیت دونوں کا منتہیٰ نہ ہو۔ محبت اور خشیت کا اجتماع پہلے قدم پر جذبۂ پرستش پیدا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اطاعت کی تفصیل عمل میں آتی ہے۔ کمال بندگی کی سطح پر پہنچ کر احکام پر عمل کرنے کی حالت اور سجدے کی حالت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسی لئے ہم پھر اصرار کر رہے ہیں کہ پرستش و اطاعت میں فی الاصل کوئی مغائرت نہیں ہے لیکن ہمارے دور میں بدقسمتی سے یہ مغائرت پیدا کر دی گئی ہے اور اس کا نقصان زیادہ تر ذوقِ پرستش کو پہنچ رہا ہے۔ اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ ان دونوں کی واقعی ترتیب کو زور دے کر بیان کر دیا جائے ورنہ مقصود یہی ہے کہ اطاعت جذبۂ پرستش کا اظہار بن جائے اور پرستش قوت اطاعت میں ڈھل جائے۔ ہمارا دین ہم سے یہی چاہتا ہے۔

سیّد خالد جامعی

ٹیکنالوجی اور ٹیکنو سائنس

جدید سائنس اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق

جناب پروفیسر شاہد رشید صاحب نے ''البرہان'' جولائی ، اگست ۲۰۱۱ء کے شماروں میں راقم الحروف اور جناب ڈاکٹر وہاب سوری صاحب کی گفتگو پر اپنے شبہات کا اظہار ستمبر ۲۰۱۱ء کے'' البرہان'' میں کیا ہے ــــ اس سے پہلے کہ محترم شاہد صاحب کے سوالات، شبہات اور اعتراضات کا (جن میں سے بیشتر غلط فہمی کی بنیاد پر قائم کئے گئے ہیں) جواب دیا جائے چند بنیادی مباحث واضح کیے جارہے ہیں تاکہ یہ مکالمہ ایک طے شدہ منہاج میں کیا جائے اور اپنے منطقی انجام تک پہنچے نہ کہ محض غلط فہمیوں اور الزام در الزام قسم کی کوئی چیز بن جائے۔

۱۔مغربی سائنس کی حقیقت

جب ہم سائنس کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد یونانی سائنس ، قدیم سائنس[Classical Science]، سکالسٹک سائنس[Scholastic Science] ارسطو کی سائنس [Aristotal Science]، اسلامی سائنس[Islamic Science] نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد جدید سائنس[Modren Science] ہوتی ہے جس کا ایک خاص تعلق اس مابعد الطبیعیاتی انقلاب سے ہے جسے ہم فلسفے اور سائنس کی زبان میں کوپرنیکی انقلاب [Copernecian Revolution] کے نام سے جانتے ہیں جس نے علمیت (تصور وفلسفۂ علم یعنی Epistemology)کے پیمانے تبدیل کردیے۔ اس انقلاب کی فلسفیانہ تشریح کانٹ کے فلسفیانہ کام کے ذریعے منظر عام پر آئی۔ کانٹ کے فلسفے نے ۱۷ویں صدی سے پہلے کے تمام فلسفوں اور مابعد الطبیعیاتی اساسات کو منہدم کرکے نئ مابعد الطبیعیات کی بنیاد رکھی جسے ہم ہائیڈیگر کے الفاظ میں 'حاضر و موجود کی مابعد الطبیعیات'[Metaphysics of Presence] کہتے ہیں۔کانٹ نے کہا کہ ماورائے طبیعیات کا علم ہم میسر ذرائع علم [عقل،وجدان،حواس، تجربات] کے ذریعے حاصل نہیں کرسکتے۔حقیقت مطلق کیا ہے؟اس کا ادراک میسر و موجود ذرائعِ علم سے ممکن نہیں۔گویا ہم حقیقت کی حقیقت نہیں جان سکتے کیونکہ علم مظاہر [Phenomenon] تک محدود ہے، مشاہدے اور حسی تجربے سے ہی ممکن ہے اور مستور و مخفی اشیاء کا علم [Nomenon] انسان کے لیے ممکن نہیں۔ہم حقیقت کی کنہہ نہیں جان سکتے لیکن ہم حقیقت تخلیق کرسکتے ہیں اور اس تخلیق شدہ حقیقت کو کائنات پر مسلط بھی کرسکتے ہیں۔ یہی آزادی[Freedom] کے فلسفے کا حاصل ہے لہذا تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ انسان نے تلاش و جستجوئے حقیقت کے بجائے تخلیق حقیقت [Creation of Reality] کا فلسفہ ایجاد کیا جس کے

نتیجے میں حقیقت مطلق اور ما بعد الطبیعیاتی سوالات غیر عقلی قرار پائے۔ انسان کے لیے حقیقت الحقائق اور ماورائے طبیعیات کا علم ناممکن الحصول قرار پایا اور یہ طبعی، مادی، تجربی، حسی دنیا اور اس کے حصول کے جملہ مادی طبیعی تجربی علوم ہی اصل علوم قرار پائے۔

اس فلسفے کے نتیجے میں طبعی علوم اور سائنسی ترقی کی غیر معمولی رفتار نے دنیا کو حیران کر دیا۔ جب علم کا مطلب محض مادی رہ گیا اور علم کا مقصد صرف مادی ترقی ہی قرار پایا تو جدید انسان نے اپنی توانائیاں، حکومتوں نے اپنا تمام سرمایہ اور قوتیں اسی شعبے میں صرف کیں لہٰذا زبردست مادی ترقی نے روحانیت کو بے معنی کر دیا اور ما بعد الطبیعیاتی مباحث، معاملات اور سوالات علم کے دائرے سے خارج ہو گئے۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے تمام تہذیبوں میں خصوصاً مادیت اور روحانیت ایک کلیت کا حصہ تھے۔ نقلی، عقلی اور مادی علوم ایک کُل سے وابستہ تھے اور اسی کلیت میں ان کو دیکھا اور جانچا پرکھا جاتا اور اسی کلیت میں ان کی تخلیق اور نشو و نما کا عمل ہوتا تھا مغرب کی طرح ذہن اور جسم کی دوئی [Dualism] کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ اس وقت ما بعد الطبیعیات پہلے ہوتی تھی اور اس ما بعد الطبیعیات کے مطابق علمیت وجود پذیر ہوتی تھی یعنی علمیت کا ماخذ ما بعد الطبعیات تھی۔ خود علمیت علمیت کا منبع اور سرچشمہ نہیں تھی۔ ڈیکارٹ، جو جدید فلسفے کا بانی ہے، اس نے 'I think therefore I am' کا فلسفہ پیش کر کے اُس ترتیب کو بدل دیا ــــ ڈیکارٹ کے فلسفے کے نتیجے میں علمیت پہلے آ گئی اور اس علمیت سے ما بعد الطبیعیات اخذ کی گئی ــــ ڈیکارٹ نے یہ بتایا کہ ہم علمیت کے ذریعے کیا جان سکتے ہیں اور کیا نہیں جان سکتے لہٰذا ما بعد الطبیعیات غیر اہم ہو گئی۔ جدید سائنس کا بنیادی المیہ یہی ہے کہ یہاں علمیت سے ما بعد الطبیعیات اخذ ہوتی ہے لہٰذا جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے دائرے میں صرف مادیت ہی باقی رہ گئی اس کا تعلق صرف مادہ پرستی کی اقدار سے وابستہ ہو گیا اور دیگر تمام اقدار سے منقطع ہو گیا لہٰذا جدید سائنس میں روحانیت، اسلامیت اور مذہبیت داخل کرنے کی کوشش اس سائنس کی حقیقت، حیثیت، کیفیت اور تاریخ سے ہماری عدم واقفیت ہے۔

۲۔ ٹیکنالوجی سے کیا مراد ہے؟

جب ہم ٹیکنالوجی کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد سترہویں صدی سے پہلے کے معاشروں اور تہذیبوں میں موجود ٹیکنالوجی نہیں ہے بلکہ وہ ٹیکنالوجی جو جدید سائنس کے نظریات کے تابع تخلیق کے مراحل سے گزری اور راس جدید سائنس میں موجود جدید انسان جو ہر خارجی ذریعۂ علم کا انکار

کر کے تخلیق حقیقت کے دعوے کے ساتھ نئی ما بعد الطبیعیات کو مادی سانچوں میں سرمایہ [Capital] کے ذریعے ڈھال کر ٹیکنالوجی ایجاد کر رہا تھا جسے فلسفہ سائنس اور فلسفے کی زبان میں اب عموماً ٹیکنالوجی نہیں بلکہ Techno Science کہا جاتا ہے جس کی توام اصطلاح Scientism بھی ہے لہٰذا جدید ما بعد الطبیعیاتی مسلمات، جدید سائنس اور سرمایہ داری کی تثلیث کے ذریعے جو ٹیکنو سائنس جود میں آئی اسے ہم مثلث کے ذریعے یوں ظاہر کر سکتے ہیں۔

ان معنوں میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جب جدید ما بعد الطبیعیات جو اس دنیا کو ارسطو کی زبان میں ابدی [Eternal] سمجھ کر اس دنیا کو جنت میں تبدیل کرنے کے لیے آزادی کے آدرش کے دوش بہ دوش جدید سائنس اور سرمایے کے ذریعے ٹیکنالوجی کا قالب اختیار کرتی ہے تو وہ اقداری Value laden ہوتی ہے۔ اس کی یہ اقدار جدید فلسفے میں موجود تصور انسان، تصور کائنات، تصور آخرت اور تصور حقیقت سے اخذ ہوتی ہیں جہاں انسان ایک مطلق آزاد فرد ہے کسی کو جواب دہ نہیں۔ اس کی زندگی کا مقصد محض آزادی میں اضافہ ہے، وہ خود علم کا ماخذ، منبع و سرچشمہ ہے اور وہ خود پیمانۂ علم بھی ہے۔ آزادی میں اضافے کی بے شمار شکلیں ہیں لیکن موثر ترین شکلیں سرمایہ، مارکیٹ اور ترقی ہے۔ عہد حاضر میں آزادی دو سطح پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ آزادی کا تجریدی اظہار یا شکل [Abstract form] ووٹ ہے اور آزادی کا حقیقی مادی پیکر [Concrete form] سرمایہ [Capital] ہے۔ عصر حاضر کی ٹیکنو سائنس کی ترقی سرمایہ سے شروع ہوتی ہے، سرمایہ میں ارتکاز کے لیے ہوتی ہے اور اس ارتکاز سرمایہ کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ جو شے سرمایہ سے پیدا ہوئی اور سرمایے کے ذریعے وجود میں آئی اس کا مقصد سرمایہ اور صرف سرمایہ میں اضافہ کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ارتکاز سرمایہ کا یہ عمل اور خواہش لامتناہی (   ) ہے لہٰذا ٹیکنو سائنس کی ترقی کی رفتار بھی لامتناہی ہے۔ اس کا کوئی آخری

کنارہ نہیں اس کی وسعتیں سمندروں اور آسمانوں سے بھی زیادہ ہیں ۔

۳۔ نظام سرمایہ داری کیا ہے؟

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دولت [Wealth] اور سرمایہ [Capital] میں بنیادی فرق ہے۔ یہ دونوں مترادف یا ہم معنی اصطلاحات نہیں ہیں۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا میں کہیں سرمایہ نہیں تھا۔ دولت پہلے بھی تھی اور دولت آج بھی ہے لیکن سرمایہ پہلے کبھی نہیں تھا مگر آج سرمایہ کا دور ہے۔ اسی طرح بازار اور مارکیٹ توام اصطلاحات نہیں ہیں۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا کی ہر تہذیب میں بازار ہوتا تھا مارکیٹ نہیں ہوتی تھی۔ بازار روایتی، غیر سرمایہ دارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ معاشروں میں آج بھی موجود ہیں مگر یہ رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں ان کی جگہ مارکیٹ لے رہی ہے۔ مارکیٹ خاص جدید مغربی فلسفے اور جدید مغربی آدرشوں کے آمیختے سے نکلنے والا پھل ہے۔ مارکیٹ اور سرمایہ [Market & Capital] کی اصطلاحات سمجھے بغیر آپ ''ٹیکنو سائنس'' کی اصطلاح کی حقیقت سمجھ نہیں پائیں گے اور خلط مبحث کا شکار رہیں گے لہٰذا مکالمے کے پہلے مرحلے میں ہم ان دونوں اصطلاحات کی حقیقت بھی واضح کرنے کی کوشش کریں گے تا کہ ٹیکنالوجی کی تخلیق کے ضمن میں سائنس اور سرمایہ کے تعلق کو فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ سمجھ لیا جائے اور سرمایہ کو عام کرنے اور اسے ایک نظام زندگی کے طور پر مسلط کرنے کے ضمن میں مارکیٹ کے کردار کو بھی طشت از بام کر دیا جائے۔

۴۔ جدید ٹیکنالوجی کا تعلق سرمایہ داری سے

جب ہم جدید ٹیکنالوجی کی بات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس کا واحد مقصد سرمائے میں اضافہ اور ارتکاز ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ارتکاز سرمایہ کا عمل خراج معاشرے [consumer society]، مسلسل صَرف کی حکمت عملی [Constant consumption]، لذت پرستی [Hedonism] اور افادہ پرستی [Utilitarianism] کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لوگ لذت طلبی، افادہ پرستی اور خراج معیشت کو جیسے جیسے قدر کے طور پر اختیار کرتے چلے جائیں گے ٹیکنالوجی کی ترقی تنوع اور رفتار میں لا محدود اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ جس قدر [Value]، آزادی [Freedom] اور سرمایے [Capital] نے اس ٹیکنو سائنس کو جنم دیا ہے اس کے استعمال کے نتیجے میں اس تہذیب اور معاشرت میں آزادی اور سرمایہ سے متعلق اقدار و روایات ہی عام ہوں گی وہاں اسلامی اخلاق

واقدار عام نہیں ہوسکتیں۔ گزشتہ ایک سو برس کی تاریخ ہماری دلیل کی توثیق، تائید اور تصدیق کرتی ہے۔ دنیا کے تمام روایتی اور مذہبی معاشروں میں بھی ان کی اقدار ختم ہوگئیں اور آزادی و سرمایہ کی اقدار نے ان کی جگہ لے لی۔ اصل سوال یہی ہے کہ اگر ٹیکنو سائنس غیر اقداری ہے تو یہ ہر مذہب، تہذیب اور معاشرت کی اقدار کیوں بدل دیتی ہے؟ اس لیے کہ جدید ٹیکنالوجی کا مقصد محض سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ کی ترسیل اور ارتکاز میں مسلسل، مستقل اور لا متناہی اضافہ ہی ہے۔تو یہ بیان واضح کرتا ہے کہ جس شے کا آغاز سرمایہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اس کا اختتام سرمایہ کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا لہٰذا ٹیکنو سائنس جب نظام سرمایہ داری کے بطن سے ظہور کرتی ہے تو صرف سرمایہ کی قدر ہی اس کے باطن میں پیوست ہوتی ہے۔ اسے سرمایہ داری کے مقاصد سے مختلف یا اس سے متصادم مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ متعین قدر [Guided Value] کے ساتھ اپنے سفر اور مرحلہ تخلیق کا آغاز کرتی ہے لہٰذا یہ ترقی کے سفر کے کسی لمحے میں بھی سرمایہ داری اور اس کی متعین اقدار سے الگ نہیں ہوسکتی۔

۵۔ جدید ٹیکنو سائنس کی اقدار

لہٰذا یہ مفروضہ کہ ہم صرف جدید مغربی ٹیکنالوجی یا ٹیکنو سائنس کے ہی مخالف نہیں ہیں بلکہ سترہویں صدی سے پہلے روایتی الہامی تہذیبوں میں موجود ٹیکنالوجی کے بھی خلاف ہیں ایک غلط خیال ہے اور ہم اس کی مکمل تردید کرتے ہیں۔ ہماری گفتگو کا ہدف صرف جدید ٹیکنالوجی یا ٹیکنو سائنس ہے جو اپنے آغاز سے ہی سرمایہ دارانہ علمیت، سرمایہ دارانہ شخصیت، سرمایہ دارانہ ما بعد الطبیعیات، سرمایہ دارانہ مقاصد، اہداف، ارادوں اور سرمایہ دارانہ اداروں کے ذریعے صرف اور صرف حرص، ہوس، حسد، لذت پرستی، افادہ پرستی اور معیار زندگی میں مسلسل اضافے کے ذریعے آزادی کی بے کراں وسعتوں کو فروغ دینے اور دنیا بھر کو معیار زندگی کے مذہب ''آزادی'' [Religion of Freedom] کے تسلط کے لیے ایجاد کی گئی ہے۔ چونکہ جدید ٹیکنو سائنس غیر اقداری [Value neutral] نہیں ہے بلکہ Value Lidden ہے لہٰذا خاص متعین مقاصد [Guided Values] کے لیے ایجاد کردہ اس ٹیکنو سائنس کو کسی دوسری قدر [Value]، کسی دوسرے نظریہ حیات یا کسی اور ما بعد الطبعیات کے ذریعے تبدیل کر کے سرمایہ دارانہ مابعد الطبیعیات کے سوا کسی دوسرے ما بعد الطبیعیاتی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ اسلام الہامی

نظریۂ حیات ہے اور اس کی مابعد الطبیعیاتی اساسات جدید مغربی فلسفے اور جدید سائنس وٹیکنالوجی کی مابعد الطبیعیاتی اساسات سے یکسر مختلف ہیں لہٰذا اسلامی الہیات وعقائد کی روشنی میں اسلامی تہذیب کے اندر ٹیکنالوجیکل ترقی کی وہ رفتار ممکن ہی نہیں جو سرمایہ داری کی اساس اور قدر پر قائم ٹیکنو سائنس کے منہاج میں ہر لمحہ ممکن نظر آتی ہے۔اٹھارہویں صدی سے پہلے کی تہذیبوں میں ٹیکنالوجی انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایجاد ہوتی تھی لیکن ٹیکنو سائنس کا مقصد ضروریات کو پورا کرنا نہیں ضروریات کو تخلیق کرنا بلکہ لا محدود پیمانے پر تخلیق کرتے چلے جانا ہے تاکہ خراچ معاشرہ [Consumer Society] بڑھتا اور پھیلتا رہے۔اس طرح سرمایے کے چکر [Capital Circle] کے چلتے رہنے اور سہولتوں اور ٹیکنالوجی میں مسلسل ترقی کے نام پر لوگوں کو اربوں کھربوں ٹن کوڑا پیدا ہوگیا ہے اور جو کوڑا پیدا ہو رہا ہے اس کو ٹھکانے لگانے کے مسائل سنگین رخ اختیار کر چکے ہیں۔ضرورت کے لیے کسی ایجاد کا ظہور پذیر ہونا اور ضروریات کی تخلیق کرنا دو مختلف کام ہیں مثلاً قلعے کی فصیلوں کو توڑنے کی ضرورت پیش آئی تو منجنیق ایجاد کر لی گئی مگر فصیل توڑنے کے فوراً بعد فصیلوں کو آناً فاناً تعمیر کرنے کی مشین ایجاد کرنے کا خیال لوگوں کو نہیں آیا۔اہرام مصر تعمیر ہوئے مگر اہرام کی ٹیکنالوجی فروخت کر کے اس سے نفع کمانے اور اسے برآمد کرنے [Export] کا خیال کسی قلب میں نہیں پیدا ہوا۔اس کا سبب ان تہذیبوں کا مابعد الطبیعیاتی تناظر تھا جہاں مادی زندگی کل زندگی کا ایک حصہ تھی صرف مادی زندگی کو مکمل زندگی نہیں تصور کیا جاتا تھا۔

۶۔ جدید ٹیکنالوجی مغربی علمیت کا منطقی نتیجہ ہے

پروفیسر شاہد رشید صاحب کی اس رائے سے راقم کو اختلاف ہے نہ ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کو کہ کسی معاشرے اور تہذیب میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی اس تہذیب کی تہہ میں کارفرما فلسفۂ علم اور اس کے مخصوص تصور کائنات یعنی مابعد الطبیعیاتی تصورات کی حامل ہوتی ہے اور یہی تصورات نہ صرف اس معاشرے کی بلکہ اس معاشرے کی تخلیقی سرگرمیوں کی صورت گری بھی کرتے ہیں کیونکہ ٹیکنو سائنس اٹھارہویں صدی میں مغرب کے جدید فلسفے اور جدید تعقل کے غلبے کے زیر اثر وجود پذیر ہوتی ہے لہٰذا اس ٹیکنو سائنس میں مغرب کی مسلمہ اقدار آزادی اور ترقی کے سوا کوئی اور قدر داخل ہی نہیں کی جاسکتی اور اگر آزادی اور ترقی کے سوا کسی الہامی تہذیب کی کوئی قدر اس ٹیکنو سائنس میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ٹیکنالوجی کے غبارے سے ہوا ایک لمحے میں نکل جائے گی

کیونکہ یہ ترقی صرف سرمایہ کے ساتھ ممکن ہے۔ سرمایہ اور سائنس کو الگ کرتے ہی جدید ٹیکنالوجی کا پھولتا ہوا غبارہ پھٹ کر سمٹ جائے گا لہٰذا اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسلامی تہذیب میں پیدا ہونے والی سائنس وٹیکنالوجی اور اس ٹیکنالوجی کا طریقہ اور اس کے مقاصد و اہداف مغربی فلسفے کے تحت پیدا ہونے والی سائنس وٹیکنالوجی سے یکسر مختلف ہوں گے۔ اسلامی تہذیب کی ٹیکنالوجی اسلامی مابعد الطبیعیات کے اصل مقصد[فکر آخرت اور معرفت رب] سے لازما ہم آہنگ ہوگی اور جدید مغربی ٹیکنالوجی مغربی فلسفے کے مقاصد[آزادی اور ترقی کے اصولوں] سے ہم آہنگ ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی مسلم مفکر یہ دعویٰ کر دے کہ انبیاء کی آمد کا مقصد بھی مادی ترقی اور آزادی میں مسلسل اضافہ تھا اور وہ معیار زندگی بلند کرانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ لہٰذا اگر ٹیکنو سائنس میں الہامی مابعد الطبیعیات داخل کر دی جائے تو اس کی ترقی ٹھٹھر کر رہ جائے گی اور ممکن ہے کہ ترقی کا عمل ہی منجمد ہو جائے۔ مثلاً جدید تباہ کن عسکری ہتھیار، نیوکلیئر ٹیکنالوجی، فلم، جمالیات، فیشن اور فوڈ کی صنعتیں، تفریح اور لذت پرستی کی صنعت[Entertainment Industry]، اشتہاری صنعت، [Advertisment]، سیاحت کی صنعت [Tourism Industry]، پلاسٹک سرجری، اسقاط حمل کی ادویات کی صنعت، نفسیاتی امراض اور امراض قلب سے متعلق مختلف صنعتیں اسلامی نظریہ حیات کے موثر اطلاق کے ساتھ ہی لمحوں میں ختم ہو جائیں گی۔

۷۔ مغربی ٹیکنالوجیکل ترقی کسی دوسری علمیت میں ممکن ہی نہیں

اگر مغرب میں آج سرمایہ کی لامتناہی بڑھوتری پر حدود نافذ کر دی جائیں تو یقیناً یہ پابندی ٹیکنو سائنس کی ترقی کی رفتار میں زبردست رکاوٹ پیدا کرے گی اور ایسی پابندی مغرب کے فلسفہ آزادی [Philosophy of Freedom] کے منافی ہوگی کیونکہ آزادی کے اظہار کے لامحدود طریقے ہیں لہٰذا آزادی کو کسی خاص طریقے سے اظہار کا پابند کرنا آزادی کے اصول اور قدر کے منافی رویہ ہے۔ اس فلسفے کی تشریح سمجھنے کے لیے اس صدی کے ایک بڑے سیاسی فلسفی John Rawls کی کتاب Theory of Justice کا مطالعہ مفید رہے گا۔

روس میں ریاستی مداخلت کے بغیر آزادانہ مسابقت [Free Market] کے لبرل فلسفے کے بجائے جب سرکاری منصوبہ بندی [Planning] کے ذریعے ٹیکنالوجیکل ترقی کی بھرپور کوشش کی گئی تو کئی جہتوں میں یہ کوشش کامیاب ہونے کے باوجود فری مارکیٹ کے ذریعے وباء کی طرح پھیلنے والی

ٹیکنالوجی کا مقابلہ کرنے میں مکمل ناکام رہی حالانکہ مغرب اور روس دونوں سرمایہ کے ذریعے آزادی، مساوات، ترقی اور معیار زندگی میں ٹیکنالوجی کے ذریعے مسلسل اضافے کی اقدار پر یکساں یقین رکھتے تھے لیکن لبرل سرمایہ دارانہ نظام ہر شخص کو اس کی صلاحیت یعنی قوت خرید کے مطابق مساوی طور پر [Each according to his effeciency] ٹیکنالوجی مہیا کرنے پر یقین رکھتا تھا جبکہ روس ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق [Each according to his needs] ٹیکنالوجی مہیا کرنے کے فلسفے پر عامل تھا لہٰذا لبرل سرمایہ داری میں جس تنوع، برق رفتاری، کمال فن اور جمالیاتی کشش کے ساتھ ٹیکنالوجیکل ترقی ممکن ہوئی غیر لبرل روس میں وہ ترقی نہ ہوسکی کیونکہ وہاں ٹیکنالوجی کی ترقی پر حکومتی تحدیدات عائد تھیں وہ مساوات کے اصول کے تحت ہر ایک کو ٹیکنالوجی مہیا کرتے تھے جس کے لیے لوگوں کو انتظار کرنا پڑتا تھا اور قطار میں کھڑا ہونا ضروری تھا جس سے ان کی آزادی متاثر ہورہی تھی۔ آزادی پر مساوات اور ضرورت کا اصول حد بندیاں عائد کررہا تھا۔لبرل سرمایہ دارانہ نظام یعنی امریکہ و یوروپ میں جس کے پاس سرمایہ ہے وہ انتظار کے بغیر ٹیکنالوجی جب چاہے خرید سکتا تھا اور ریاست کا محتاج نہ تھا کیونکہ مارکیٹ آزادانہ عمل کے ذریعے ریاست سے بہتر انداز میں اسے ٹیکنالوجی مہیا کررہی تھی۔

۸۔ مغربی ٹیکنالوجیکل ترقی کا انحصار نظام سرمایہ داری پر ہے

لبرل سرمایہ دارانہ نظریۂ حیات کے سوا ٹیکنو سائنس کو کسی اور نظریۂ حیات [Ideology] اور ما بعد الطبیعیات کی بنیاد پر مسلسل فروغ نہیں دیا جاسکتا حتیٰ کہ سرمایہ داری ہی کی شکل سوشلزم اور کمیونزم میں بھی غیر لبرل سرمایہ داری کے ذریعے ٹیکنالوجی کی محیر العقول ترقی کا خواب ناکام ہوگیا اور چین و روس کو آخر کار لبرل سرمایہ دارانہ نظام و نظم معیشت کے دامن میں پناہ لینا پڑی۔دنیا کی کسی الہامی، روایتی اور دینی تہذیب میں مادی ترقی اور مسلسل ترقی کو کبھی ہدف، مقصد اور اصول کے طور پر اختیار نہیں کیا گیا۔ان تہذیبوں میں یہ دنیاوی زندگی فانی تھی، مختصر تھی اور آخرت کی زندگی طویل اور ابدی ـــــ لہٰذا جس زندگی کا سفر طویل تھا اس سفر کی تیاری بھی زیادہ تھی اور جس مادی زندگی کا سفر مختصر تھا اس زندگی کا سروسامان بھی بہت مختصر تھا اور اس سامان کی تیاری کے سلسلے میں کوششیں بھی نہایت مختصر اور ضرورت کے مطابق رہیں ۔ لہٰذا دنیا پرستی، عیش پرستی اور افادہ پرستی کی ٹیکنالوجی کا فروغ مسلسل ان تہذیبوں کے نظریۂ حیات کے باعث ممکن ہی نہیں تھا۔لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظریۂ

حیات کے سوا کسی اور نظریے کے ذریعے ٹیکنو سائنس کو فروغ دینا ممکن نہیں۔ چونکہ اسلام ایک الہامی دین ہے جس میں آخرت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ہر حال میں ترجیح دی گئی ہے اور معرفت رب عبادت رب کے ذریعے ہی ممکن ہے اور اللہ نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے لہٰذا اس تہذیبی، مذہبی، دینی، الہامی اور علمی تناظر کے ساتھ ٹیکنو سائنس کی شیطانی ترقی اسلام کے ساتھ کبھی ہم آہنگ نہیں ہوسکتی کیونکہ اسلامی علمیت آزادی، ترقی، سرمایہ داری اور معیار زندگی میں مسلسل اضافے کے مغربی مقاصد و اہداف پر مشتمل علمیت کا رد ہے لہٰذا اسلام کے تصور سائنس و ٹیکنالوجی کے تناظر میں عہد حاضر کی اندھا دھند فنی ترقی [Technological Development] کا امکان معدوم ہو جاتا ہے۔

۹۔ ترقی کا مفہوم کیا ہے؟

یہاں اس نکتے پر غور کی ضرورت ہے کہ Development & Progress کی اصطلاحات کیا اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا کی مختلف تہذیبوں کی علمیت اور لغت میں اصطلاحات کے طور پر مستعمل تھیں یا نہیں؟ Development Dictionary اس سلسلے میں حیرت انگیز معلومات مہیا کرتی ہے یعنی یہ لغت دلائل کے ساتھ جواب نفی میں دے گی۔ان دونوں اصطلاحات کی تاریخی حقیقت کا مطالعہ کیا جائے تو حیرت کے کئی دریچے کھلتے نظر آتے ہیں۔

''ترقی'' ایک حساس موضوع ہے جس کا مطلب صرف ''مادی ترقی'' ہے اور اس پر ایمان کے باعث ''ٹیکنالوجیکل ترقی'' کا سوال ہر مخلص مسلم ذہن میں لازماً پیدا ہوتا ہے لیکن صرف چند مباحث ترقی کی ماہیت، حقیقت، حیثیت اور اصلیت کا تعین کر دیتے ہیں مثلاً حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کسی ہسپتال میں نہیں ہوئی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کسی میٹرنٹی ہوم میں نہیں بلکہ صحراء میں ہوئی۔ رسالت مآب ﷺ کی پیدائش بھی گھر میں ہی ہوئی۔ آپ ﷺ کے تمام بچے بھی گھر میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک اس امت کے اکابرین گھروں میں ہی پیدا ہوتے رہے تو حضرت ابراہیمؑ سے رسالت مآب ﷺ تک تین انبیاء کی امتوں کے عہد میں ترقی کیوں نہ ہوسکی میٹرنٹی ہوم کیوں نہ بن سکے؟ یہ ترقی مغرب میں کیسے ممکن ہوگئی جب کہ وہاں عورت نہ گھر میں رہنے پر تیار ہے نہ شادی کرنے پر ــــ نہ شادی کے بعد بچے پیدا کرنے پر ــ تو اس تہذیب کو میٹرنٹی ہوم کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ انبیاء کی تہذیبوں میں آغا خان یونیورسٹی جیسا ہسپتال کیوں

نہ بن سکا؟ حضرت موسیٰ کے عہد میں فرعون کی تہذیب میں بھی بچے کو دودھ عورت پلاتی تھی۔ اسلام آیا تو رضاعت کی ذمہ داری عورت کے سپرد کی گئی اور اٹھارہویں صدی سے پہلے ملت اسلامیہ بلکہ کل عالم ڈبے کے جعلی دودھ سے بے خبر تھا۔ انبیاء کی امتیں بچوں کے لیے مصنوعی دودھ کیوں تیار نہ کرسکیں؟ انبیاء کی تہذیبوں میں ایٹم بم اور تباہ کن ہتھیار کیوں تیار نہ ہوسکے؟ روایتی تہذیبیں بھی مہلک ہتھیاروں سے خالی رہیں اس لیے کہ ان کی مابعد الطبیعیات عہد جدید کے مغرب سے مختلف تھی۔ انبیاء کے مد مقابل تہذیبوں کی عظیم الشان عمارات اور شاہکار تعمیرات کے آثار وباقیات آج بھی محفوظ ہیں لیکن ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے مادی آثار میں سے صرف دو عمارتیں محفوظ ہیں

ایک خانہ کعبہ کی چوکور پتھریلی عمارت اور دوسری حجرۂ نبوی جہاں تاریخ کے تین عظیم انسان ابدی نیند سورہے ہیں لیکن ان انبیاء کا ذکر مشرق ومغرب میں صبح وشام جاری ہے۔ وہ قومیں جو انبیاء کے مد مقابل تھیں ان کے عظیم الشان مادی آثار اور سائنس وٹیکنالوجی کے شاہکار آج بھی محفوظ ہیں مگر ان منکرین حق کا نام لیوا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر 'ترقی' انبیاء کے مقاصد و اہداف میں ادنی درجے کا بھی ہدف ہوتا تو یقیناً عاد، ثمود، سباء اور فرعون کی قوموں کے مد مقابل انبیاء ان قوموں جیسی سائنس و ٹیکنالوجی اختیار کرتے یا اس میں اضافہ کرتے مگر اضافہ تو کجا ان انبیاء نے تباہ شدہ قوموں کی سائنس و ٹیکنالوجی کو سرے سے اختیار ہی نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتے اور ترقی کے پہیے کو آگے بڑھاتے تو حضرت موسیٰ کی قوم بنی اسرائیل کے اہرام بھی روئے زمین پر محفوظ ہوتے۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ انبیاء تاریخ کے پہیے کو ہمیشہ پیچھے کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اسی لیے امت مسلمہ آج بھی آگے دیکھنے کے بجائے ہمیشہ پندرہ سو سال پیچھے کے عہد 'خیر القرون' کی طرف دیکھتی ہے اور جمعہ کے خطبے میں اسی عہد کو بہترین زمانہ کہتی ہے یہ بات یقینی ہے کہ مسافر اگر بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا رہے تو اس کی رفتار سفر بہت کم ہو جاتی ہے اسی لیے انبیاء کی امتیں مادی فتوحات میں ہمیشہ اپنے مد مقابل کفار و مشرکین سے کمتر رہیں مگر ایمان کے معاملے میں نہایت برتر اور زرخیز۔

۱۰۔ مغربی ٹیکنالوجی اقدار کش ہے

ٹیکنو سائنس میں آزادی، ترقی اور مسلسل ترقی اور سرمایہ دارانہ اقدار کے سوا دوسری اقدار کو داخل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ٹیکنو سائنس آفاقی اور عالمگیر علم نہیں۔ یہ خاص تاریخ، تہذیب اور خاص زماں و مکاں میں محصور علم ہے جو اپنے مقاصد، اہداف اور تحدیدات سے ماوراء نہیں ہوسکتا۔ یہ معروضی نہیں

موضوعی ٹیکنالوجی ہے۔ عالمی فلسفہ کانگریس کے صدر ہزرل نے ۱۹۲۴ء میں اس سائنس کو یورپی سائنس قرار دے کر اس پر نقد کیا تھا۔ اس کی کتاب "Crises of European sciences" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے شاگرد ہائیڈیگر نے ۱۹۲۶ء میں اپنی کتاب "An Essay Concerning Technology" میں اس ٹیکنالوجی کے ہاتھوں دنیا کی مسخ ہونے والی تصویر کی نشان دہی کردی تھی۔ آج بھی مغرب میں بے شمار فلسفی مفکرین ٹیکنو سائنس کو غیر اقداری تصور نہیں کرتے اس ضمن میں درج ذیل مصادر کا مطالعہ مفید رہے گا:

- *Looking back towards Progress,* Perwaiz Manzoor.
- *The Limits of Technology,* Charles Tilly.
- *Ten Astonishing facts about Technology.*
- *Technology and its Problems,* Illule.
- *The Constitution of liberty*, Hiac
- *Philosophy - An Introduction,* Berry Vincint
- *Post Modern Conditions,* Leyotard
- *One Dimensional Man,* Marcuze
- *Insane Society*, Mozzalis
- *Risk Society,* Arec Fromm
- *Habits of the Heart,* Danial Bell
- *The Logic of Social Sciences,* Hebermass
- *The Order of things: The Archeology of Knowledge,* Focualt
- *Cotegency Irony and Solidrity*, Rorty
- *False Dawn,* John Gray

۱۱۔ ٹیکنو سائنس اور سرمایہ داری کا مطالعہ

ٹیکنو سائنس اور سرمایہ داریت کے تعلق خصوصی کے سلسلے میں درج ذیل کتب کا مطالعہ فائدہ مند رہے گا:

- *Cultural Contradictions of Capitalism,* Richard Bela
- *The Confessions of an Economic Hit man,*

- *The Corporation*
- *The Beauty Myth*
- *History of Economic Thought,* Shoumpter
- *The Revival of Market Society,* Hershman
- *Capitalism - A Schezofranic Life Style,* Deluze
- *Thousands plautos* Vol. I
- *Anti Edipus* Vol. II
- *The Rise of Islamic Capitalism,* Dr. Wali Raza Nasar

۱۲۔ عالم اسلام اور مغربی ٹیکنالوجی

عالم اسلام میں ایک مغالطہ بہت عام ہے کہ 'اگر ہمارے پاس مغرب کی ایجاد کردہ ٹیکنالوجی نہیں ہوگی تو ہم مغرب کا عسکری مقابلہ کیسے کریں گے؟' گویا عالم اسلام کا ہر فرد حالت جہاد میں ہے، ہر حکومت جہاد کے لیے بے تاب ہے، لوگ جہاد کے لیے مچل رہے ہیں اور لشکر راستے میں بزن کے منتظر ہیں مگر اس جہاد میں اصل رکاوٹ ٹیکنالوجی سے محرومی ہے لہٰذا ٹیکنالوجی سے عشق اسلام کے دفاع کے لیے شروع ہوتا ہے اور ہم دفاعی اور اقدامی عسکری ٹیکنالوجی کی بجائے صرف بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی اور تعیّشات زندگی میں اضافے کی ٹیکنالوجی کا دفاع اس اصول کی بنیاد پر کرنے لگتے ہیں کہ اس میں کیا ہرج ہے؟ حرام تو نہیں ہے؟ منع تو نہیں کیا گیا ہے؟ خوش حال پُر تکلف اور آرام دہ زندگی بسر کرنے میں کیا ہرج ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ ٹیکنالوجی کس قیمت پر حاصل ہوتی ہے؟ اس کی قیمت Algor کی کتاب *An Inconvenient Truth* میں پڑھی جاسکتی ہے۔ اس کی مزید تفصیل Penguin کی کتاب *The Waste* میں پڑھی جاسکتی ہے ماحولیات پر کوپن ہیگن کانفرنس ۲۰۱۰ء کی روداد انٹرنیٹ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے جو حیرت کے کئی جہانوں کے دریچے کھول دے گی۔ مشہور امریکی مورخ Jared Diamond کی کتاب *How Socities Chose to Fail or Survive?* کا باب بارہ جو چین کی بظاہر عظیم الشان ترقی سے متعلق ہے اور اس ترقی کی جو بھیانک قیمت چین نے ادا کی ہے اور صرف چین نہیں بلکہ چین کے ساتھ تقریباً پوری دنیا اور ایشیا خصوصی طور پر اس کی قیمت ادا کر رہا ہے، اس کا مطالعہ کافی ہے۔

عالم اسلام کی وہ حکومتیں جو بنیادی حقوق کے منشور پر دستخط کر چکی ہیں، ان ریاستوں کا غالب

قانون اصولاً اور عملاً اب اسلام نہیں آزادی اور نظام سرمایہ داری ہے اور سرمایہ دارانہ ریاست سرمایے میں اضافہ کے لیے تو جہاد کر سکتی ہے اللہ کے لیے جہاد اس ریاست میں ممکن ہی نہیں ہے۔ حقوق انسانی کے منشور پر دستخط کرنے والی دنیا میں کوئی ایسی مسلم ریاست نہیں جو مغرب یا امریکہ سے اقدامی جنگ کرنا چاہتی ہو لیکن ٹیکنالوجی کے باعث جنگ نہ کرنے پر مجبور ہوگئی ہو۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ مسلم ملک مغرب کی جانب سے حملے کے پیش نظر اپنے دفاع کے لئے فکرمند ہوسکتا ہے لہٰذا اسے دفاعی ٹیکنالوجی کی ضرورت رہے گی لیکن مغرب نے جو عسکری ٹیکنالوجی ایجاد کی ہے وہ دفاعی سے زیادہ اقدامی ہے۔ وہ فتح کے لئے ایجاد نہیں کی گئی تباہی و بربادی (Mass Destruction) کے لئے ایجاد ہوئی ہے۔ عسکری صنعتوں کی پیداوار [Armed Industries Production] اقدامی جنگ کے لئے تخلیق ہو رہی ہے اور عالم اسلام کسی اقدامی جنگ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسلامی ممالک کی فوجیں عموماً اپنے ہی شہریوں کے خلاف اقدام کرتی ہیں۔ ان کی تمام عظیم انسانی فتوحات کا دائرہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف اور اپنی سرحدوں پر محیط ہے۔ تو مسئلہ ہے دفاع کا اور دلیل دی جا رہی ہے اقدامی جنگ کے ہتھیاروں کے حصول کی۔ گزشتہ سو سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن ممالک نے ٹیکنالوجی پر زیادہ انحصار کیا وہ کسی بڑی جنگ لڑنے کے قابل نہیں رہے لیکن نہایت پست اور کمتر ٹیکنالوجی کے حامل ممالک نے اپنے سے بہتر اور برتر ٹیکنالوجی والے ممالک کو شکست دی ہے۔ لاطینی امریکہ، کمبوڈیا، صومالیہ، عراق، ویت نام، افغانستان، فلسطین میں کمتر ٹیکنالوجی والوں کو عالمی طاقتیں شکست نہیں دے سکیں۔ ماضی میں بھی یونان کی ایک چھوٹی ریاست کے سپہ سالار مقدونیہ کے سکندر نے اکیس سال کی عمر میں ایران جیسی عظیم الشان سلطنت پر حملہ کیا اور اسے عبرتناک شکست دی، بادشاہ کو قتل کر دیا اور ایرانی فوج کو تہس نہس کر دیا لیکن ایران کو شکست دینے والے سپہ سالار کو جہلم کی چھوٹی سی ریاست کے راجہ پورس کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ سکندر کی فوج نے دریائے جہلم پار کرنے سے انکار کر دیا وہ سندھ اور عراق کے راستے بابل پہنچا اور وہاں پہنچتے ہی مر گیا۔ عباسی سلطنت 'بیت الحکمت' اور تمدنی ترقیات کے باعث تاتاریوں کے مقابلے میں نہایت متمدن ترقی یافتہ ریاست تھی لیکن ٹیکنالوجیکل برتری کے باوجود تاتاریوں جیسی جاہل قوم نے انھیں شکست دے دی۔ اندلس میں سائنسی ترقی کے باوجود سائنس مسلمانوں کے زوال کو نہیں روک سکی اور عیسائیوں نے ہسپانیہ کے حصے بخرے کر دیے، مسلمانوں کا قتل عام کیا اور انھیں بے دخل

کر دیا۔ سرزمین اندلس آج اذان کی آواز سے بھی محروم ہے۔ روس کے پاس مغرب سے بہتر ٹیکنالوجی تھی۔ اس نے سائنس کے مختلف میدانوں میں مغرب سے پہلے اقدامات کیے۔ خلائی ٹیکنالوجی میں وہ امریکہ سے آگے تھا لیکن اس کی ٹیکنالوجیکل ترقی اسے زوال سے نہیں بچاسکی۔ اسے امریکہ نے میدان جنگ میں شکست نہیں دی بلکہ اسے اپنی تہذیب ، ثقافت، معیار زندگی ، فری مارکیٹ اور اپنے لبرل نظریے کی قوت سے اسے شکست دی۔ روس کے لوگ امریکی ڈبل روٹی اور چپس کے انتظار میں رہنے لگے تھے۔ مشرقی یورپ کو مغرب نے تلوار، یلغار اور خون خرابے سے نہیں نظریاتی محاذ پر شکست دی اور دیوار برلن گرادی۔

امتوں ،تہذیبوں اورقوموں کا اصل مقابلہ عسکری میدان میں نہیں نظریاتی میدان میں ہوتا ہے۔ نظریہ اگر زندہ ہے طاقت ور ہے تو دو چار عسکری شکستوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔جس طرح عباسی سلطنت تاتاریوں اور باطنیوں سے شکست کھانے کے باوجود دوبارہ زندہ ہوگئی کیونکہ تاتاری اور مصر کے فاطمی ایمان،عقلیت اور علمیت کی سطح پر عباسیوں کی دینی علمیت کو شکست نہیں دے سکے لہٰذا عباسیوں کی دونوں شکستیں آخر کار فتح میں تبدیل ہوگئیں ۔خوارزم شاہ اور عباسی سلطنتیں تہذیبی ،تمدنی، عسکری سائنسی اور ٹیکنالوجی کی سطح پر تاتاریوں سے بہتر تھیں مگر ان کی ٹیکنالوجی انھیں بچا نہیں سکی۔ تاتاریوں نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنی تلواروں سے اسلامی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ تاتاری سادہ اور جنگ جو تھے جبکہ مسلمان عیاش تھے اور تاتاری سیل رواں کے سامنے تنکوں کی طرح بہہ گئے۔ برعظیم پاک و ہند میں انگریز ،فرانسیسی اور ولندیزی وارد ہوئے تو ہندوستان کے مسلمان انھیں بے دخل نہیں کر سکے کیونکہ وہ عیش وعشرت کی زندگی میں مبتلا تھے اور لڑنے کی صلاحیت ہی کھو چکے تھے۔ٹیکنالوجیکل سطح پر انگریزی فوج ان سے بہتر اور برتر نہیں تھی۔ وہ سات سمندر پار سے گرم علاقوں میں آئے تھے۔ ان کے لیے کمک کا موثر انتظام بھی نہیں تھا اور وہ تعداد میں بھی بہت کم تھے۔ اجنبی ملک، نا قابل برداشت موسم اوراجنبی زبان کے باوجود وہ یہاں آئے۔ انہوں نے ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مسلمانوں کو شکست نہیں دی۔سراج الدولہ کے لشکر میں ایک لاکھ سپاہی تھے مگر لشکر نے انگریز فوج سے جنگ ہی نہیں کی۔صرف سراج الدولہ کے ایک وفادار ہندو سپہ سالار کے مختصر لشکر نے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ترکی کی مثال سامنے ہے۔ برطانیہ ترکی کے مقابلے میں عالمی طاقت تھا، ایک ایسی سلطنت جس کی حدود میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، ترکی پر اسے ٹیکنالوجیکل برتری بھی

حاصل تھی لیکن مصطفےٰ کمال اتاترک کی قیادت میں ترک قوم نے برطانوی فوج کو عبرت ناک شکست دی اور سمندر انگریزی فوج کے خون سے رنگین کر دیا۔ حالیہ سالوں میں بوسنیا کی جنگ اس کا تازہ ثبوت ہے۔ سربوں کو یورپی ممالک کی جانب سے مکمل مالی، عسکری اور ٹیکنالوجیکل امداد مل رہی تھی۔ بوسنیا والے مسلسل شکست کھا رہے تھے اورامریکہ، NATO اور UNO بوسنیا کی مدد پر آمادہ نہیں تھے۔ اس موقع پر پوری دنیا سے مسلم مجاہدین بوسنیا میں جمع ہوئے اور تھرڈ بریگیڈ کی صورت میں انھوں نے جدید ٹیکنالوجی کی حامل سرب فوج کا صفایا شروع کیا۔ وہ اقدام کرتے ہوئے سربوں کو شکست سے دوچار کرنے والے تھے لہٰذا سربوں کو شکست سے بچانے کے لیے نیٹو نے اپنی فوجیں اتار دیں اورامریکہ نے فضائی حملے شروع کر دیے۔ لہٰذا یہ خیال کہ ٹیکنالوجی کی کمی یا کم زور ٹیکنالوجی ہمیں دفاع یا اقدام کے قابل نہیں رہنے دیتی غلط خیال ہے۔ گوریلا جنگ کے ماہرین اور اس موضوع پر تحریر کی گئی کتابوں سے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس ہزار گوریلا سپاہی سو سال تک جنگ لڑ سکتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ عالم اسلام کسی جہاد کے لیے تیار بھی ہے؟ افغانستان میں جنگ کا آغاز کرتے ہوئے بش نے کہا تھا ہم ایک تاریک غار میں بھی جمہوریت کی شمع روشن کریں گے، طالبان دہشت گرد ہیں، ان سے آخری آدمی، آخری گولی آخری قطرہ خون تک جنگ ہوگی لیکن ۲۰۱۱ء میں امریکی صحافی کی معرکہ آراء کتاب *Obama Wars* کے ذریعے دنیا کو بتایا جا رہا ہے کہ ہمیں طالبان اور القاعدہ میں فرق کرنا چاہیے۔ طالبان سے مذاکرات کی میز پر معاملات طے کیے جائیں۔ طالبان سے سیاسی مفاہمت کے لیے امریکہ مسلسل خاموش سفارت کاری کے محاذ پر مستقل کام کر رہا ہے۔ طالبان کو امریکہ عسکری میدان میں زبردست ترقی کے باوجود شکست نہیں دے سکا لہٰذا ٹیکنالوجی سے محرومی کے خوف میں مبتلا ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ ہی اس خوف کی تاریخی وجوہات تلاش کی جاسکتی ہیں۔ یہ خود ساختہ اور خود مسلط کردہ خوف ہے جو مغلوبیت کے باعث پیدا ہو رہا ہے۔

۱۳۔ ٹیکنالوجی پر تنقید کا مقصد

جب ہم سائنس اور ٹیکنالوجی پر تنقید کرتے ہیں تو لوگوں کو پتھر کا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ کسی کو اونٹ کی پیٹھ نظر آتی ہے کہ یہ لوگ ہمیں دور ظلمات میں واپس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ سائنس اور ٹیکنو سائنس پر تنقید کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ لوگ تنقید پڑھتے ہی تمام اشیاء کا استعمال ترک کر دیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں بلکہ سائنس پر تنقید کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سائنس کو ایک

مقدس گائے نہ سمجھیں، سائنسی علم کو محترم، عظیم الشان، نا قابل تنقید اور معصوم علم وفن کا درجہ نہ دیا جائے، اس کی وہ عزت، تکریم، تحریم اور اکرام و احترام نہ کیا جائے جیسے یہ کوئی صحیفہ آسمانی ہے۔ اسے

> مغربی سائنس کے حوالے سے البرہان کا نقطۂ نظر واضح ہے کہ یہ مغرب کے ورلڈ ویو کا منطقی نتیجہ ہے اور چونکہ مغرب کے ورلڈ ویو کی اساسات ملحدانہ ہیں لہٰذا مغربی فلسفۂ علم نے جن علوم وفنون کو جنم دیا ہے وہ بھی مذہب و اخلاق دشمن اور اقدار کش رجحانات رکھتے ہیں۔ ہمارے علمی حلقوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اس حقیقت کا ادراک کیا اور سائنس کی اسلامی تشکیل نو کا نعرہ بلند کیا۔ انہوں نے اس پر کام بھی شروع کیا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ بعد میں انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، امریکہ (IIIT) نے جب علوم کی اسلامائزیشن کا کام شروع کیا تو انہوں نے سائنسی علوم کی بجائے عمرانی علوم پر زیادہ توجہ مرکوز کی جن کی اہمیت بھی اس ضمن میں مسلمہ ہے۔
>
> البرہان موجودہ سلسلۂ مضامین کے ذریعے یہ حقیقت سامنے لانا چاہتا ہے کہ ماضی میں جب مسلمانوں نے سائنس میں پیش رفت کی تو یہ اسلامی تعلیمات کا منطقی اور لازمی نتیجہ تھا۔ انہی تعلیمات کا لازمی تقاضا ہے کہ مسلمان آج بھی سائنس میں ترقی کریں اور جس طرح ماضی میں سائنسی ترقی اسلامی تعلیمات، مقاصد اور مزاج کے مطابق تھی اب بھی جو سائنسی ترقی ہوگی وہ اسلامی تعلیمات، مقاصد اور مزاج کے مطابق ہوگی۔ لہٰذا مسلمانوں اور خصوصاً ان کی حکومتوں کا فرض ہے کہ مسلم تصور علم کی روشنی میں سائنسی ترقی کی طرف پیش رفت کریں تاکہ ان کی مذہبی و اخلاقی اقدار محفوظ رہ سکیں۔
>
> یہ بھی واضح رہے کہ مسلمانوں کا 'ترقی' کا اپنا ایک مخصوص ماڈل ہے جو مغرب سے بالکل مختلف ہے یہ آخرت سے مربوط ہے اور اس کی بنیاد اخلاقی ترقی پر ہے لیکن سائنسی ترقی اس کی نقیض نہیں ہے کیونکہ اسلامی تصور علم، تعلیم کتاب وتزکیہ کے ساتھ تعلیم حکمت کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ امین

علم کے بجائے فن Art & Craft کے درجے میں رکھا جائے یہ کام چلانے کا علم ہے اسے صرف کام چلانے کے قابل ہی سمجھا جائے۔ اسے دوسرے علوم خصوصاً علوم نقلیہ کو پرکھنے کا پیمانہ نہ بنایا جائے۔ سائنس کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ اس کا اس شدت وحدت سے ناقدانہ جائزہ لیا جائے جس طرح کفار ومشرکین انبیاء کرام کے پیغام اور دعووں کا جائزہ لیتے تھے اور بہت کچھ سمجھ میں آجانے کے باوجود انبیاء کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان کا ایمان ہم سے بہتر تھا کہ وہ اپنے پرانے غلط سلط ایمان کی خاطر انبیاء کے منکر تھے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ میں سے کسی ایک کے انتخاب کی آزادی ہو تو ہم علوم نقلیہ کو حقیر سمجھ کر رد کر دیتے ہیں اور علوم عقلیہ کو بخوشی اختیار کرتے ہیں کہ یہ ہماری مادی بہتری کے لیے کارآمد ہے سائنس پر نقد اس

ذہنیت کا قلع قمع کرنے کے لیے اہم ہے (جاری ہے)۔

راشد شاذ

مسلم سائنس: اسلامی تعلیمات کا منطقی نتیجہ

وحی ربانی نے کتاب فطرت پر غور وفکر کی جو ریت قائم کی اس نے بہت جلد مسلم ذہن کو تحلیل و تجزیے اور تسخیر و اکتشاف کی راہ پر ڈال دیا۔ اب تک استخراجی منہج (duductive) کو انسانی علوم کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے تجربے اور مشاہدے کو بنیادی اہمیت دی اور اس طرح علم کا منہج بڑی حد تک استقرائی (inductive) ہوگیا۔ غور وفکر کے سانچے میں یہ فی نفسہٖ اتنی بڑی تبدیلی تھی جس نے بہت جلد انسانی تہذیب کی ہیئت بدل کر رکھ دی۔ دین مبین کی فطری اُٹھان جن خطوط پر ہوئی تھی اس کے سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متبعین کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کتاب فطرت سے آنکھیں بند کر پاتے۔ روزِ اوّل سے مسلمان اس بات سے آگاہ تھے کہ کعبۂ مشرفہ صرف ان کا قبلۂ نماز ہی نہیں بلکہ وحدت ملی کا علامیہ بھی ہے۔ سو یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا کہ مختلف بلاد امصار میں تعین قبلہ کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہو؟ فلکیات کا گہرا علم بالکل اولین مرحلے میں مسلمانوں کی دینی ضرورت بن گیا۔ پھر یہ کہ مختلف بلادو امصار میں نمازوں کے نظام الاوقات کا تعین جغرافیہ کی وسیع معلومات اور فن نقشہ نگاری میں مہارت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ قرآن مجید میں شمس وقمر کی گردش جن مقاصد کے تابع بنائی گئی ان میں ایک مقصد **لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ** بھی تھا (یونس:5)۔ گویا مسلمان مذہبی طور پر اس بات کے مکلف بنائے گئے کہ وہ شمس وقمر کی اس گردش سے اپنے تقویمِ عمل کی ترتیب میں مدد لیں۔ اس پس

منظر میں نماز پنجگانہ کے اوقات کی تحدید، سمت قبلہ کا تعین اور صومِ رمضان کے لیے قمری کلینڈر کی ترتیب ، یہ ایسے عملی اور فوری مسائل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو فی الفور مشاہدۂ کائنات کی طرف متوجہ کیا۔

وحدت قبلہ کا تقاضا تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ کسی بھی خطۂ ارضی میں رہتے ہوں پنج وقتہ نمازوں میں اپنا رُخ کعبۂ مشرفہ کی طرف کریں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دور دراز علاقوں سے تعین قبلہ کی گتھی کیسے سلجھائی جائے؟ ابتدائی ایام میں کبھی ستاروں کی مدد سے سمت قبلہ کے تعین کی کوشش کی گئی تو کبھی طلوع آفتاب سے اس کا اندازہ لگانے کی کوشش ہوئی۔ بعض علمائے فلکیات بڑے دقیق مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کعبہ کو مرکز مان کر مختلف بلاد و امصار کو بارہ جغرافیائی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ سارے تخمینے قطعیت کے احساس سے خالی تھے۔ مسلمان جب فقہی اختلاف کے گرداب میں پھنس گئے تو اختلاف قبلہ نے ایک مسلسل نزاع کی حیثیت اختیار کرلی۔ کوئی کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکہ سے مدینہ آئے تو انہوں نے جنوب کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی تھی اسی سنت پر اسپین اور وسط ایشیا کے ابتدائی مسلمانوں نے بھی عمل کیا تھا سو ہمیں چاہیے کہ تعین قبلہ کی موشگافیوں میں پڑنے کے بجائے دور دراز علاقوں میں ہم جنوب کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ کوئی اس موٴقف کو خلاف عقل بتاتا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں جنوب کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی تھی تب مکہ واقعتاً جنوب میں واقع تھا سو اس سنت کو تعین قبلہ کے لیے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ کوئی کہتا کہ حج کے لیے کارواں جس سمت کو جاتے ہیں اسے ہی سمت قبلہ سمجھا جانا چاہیے، تو کوئی کہتا کہ ان علاقوں کی پرانی مسجدیں جس رُخ پر بنی ہیں وہی ہمارے لیے کافی ہیں، تو بعض اس خیال کی پُرزور حمایت کرتے ہیں کہ علوم فلکیات کے ماہرین نے جو تحقیقات کی ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ روایتی اور غیر روایتی فہم کے ٹکراؤ نے ایک ہی مسجد میں دو قبلوں کی طرح ڈال دی۔ صورت حال کی اس نزاکت نے علمائے فلکیات کو اس مسئلہ کا قطعی حل نکالنے پر مجبور کیا۔ تحقیق و تالیف کا سلسلہ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ البیرونی کی شہرہ آفاق کتاب 'تحدید الاماکن' نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس مسئلہ کو فیصل کردیا۔ اس نے Spherical Trigonometry کی مدد سے افغانستان کے ایک شہر سے تعین قبلہ کی کامیاب کوشش کی اور پھر ان اصولوں پر کسی بھی جگہ سے سمت قبلہ کا تعین دشوار نہ رہا۔

عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی تو اس کی وجہ

ان کی آواز کی بلند آہنگی اور لہجہ کی وجد آفرینی تھی۔ بعد کے دنوں میں بالخصوص دور دراز کے بلاد وامصار میں مؤذن کے تقرر کے لیے یہ بھی دیکھا جانے لگا کہ وہ اوقات نماز کا صحیح فہم رکھتا ہو، اسے گردش قمر کی مختلف منازل کا علم ہو تاکہ وہ رات کی تاریکی میں بھی وقت کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ رفتہ رفتہ یہ مؤذن اپنے کارِ منصبی میں اس حد تک ترقی کر گئے کہ انہوں نے اوقات کے تعین کے لیے Astronomical instruments ایجاد کر ڈالے۔ علم التقویم پر کتابیں تصنیف کیں اور مختلف شہروں کے الگ الگ اوقات صلوٰۃ کی جدولیں تیار کر ڈالیں۔ سمت قبلہ کے تعین اور تحدید اوقات صلوٰۃ کی ضرورتوں نے علم المیقات کے نام سے ایک نئی فلکیاتی سائنس کو جنم دیا۔ آج ہماری مسجدوں میں اوقاتِ صلوٰۃ کا جو چارٹ ماضی کی علامت کے طور پر لٹکا دکھائی دیتا ہے اس کی جڑیں اسی علم المیقات میں پائی جاتی ہیں۔ تب خود کار گھڑیوں کا رواج نہ تھا اور تحدید وقت انتہائی پیچیدہ علم تھا جس میں ذرا سی بے احتیاطی حساب کتاب کے سارے گوشوارے الٹ کر رکھ دیتی تھی۔ اگر فلکیات بنیادی دینی ضرورت نہ ہوتی اور مسلمان اس کام کو فرض عین کی حیثیت سے انجام نہ دیتے تو شاید جدید دنیا جیسی کہ وہ آج ہے وجود میں نہ آتی۔

الخوارزمی نے جب اپنی مشہور کتاب 'الجبر و المقابلہ' تصنیف کی تو اس کے پیش نظر بھی ایک فرض عین کی ادائیگی تھی۔ آیت وراثت کے اطلاقی پہلو بعض اوقات بڑی دقیق پیچیدگیوں کو جنم دیتے جن کے حل کی مروجہ ریاضی میں تاب نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خود خلیفۂ وقت نے اس سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ تقسیم وراثت کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ایک ایسی کتاب مرتب کرے جس سے اس پیچیدہ مسئلہ کو منصفانہ انداز سے حل کیا جا سکے۔ خوارزمی نے اپنی اس کتاب کے ابتدائیے میں اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف سے وراثت کی تقسیم حتی کہ زمینوں کی پیمائش، نہروں کی کھدائی اور اس قسم کے دیگر امور میں جیومیٹرائی تقویم کا کام آسان ہو جائے گا اور خدا اس سے اس محنت کے عوض بہترین صلہ عطا کرے گا۔ کچھ اسی جذبے کا اظہار البتانی نے کتاب 'الذیج الصابی' کے ابتدائیہ میں کیا ہے۔ بقول البتانی: فلکیات کا علم تمام علوم میں ممتاز ہے جس سے روح کو بالیدگی، دل کو خوشی اور عقل کو جلا ملتی ہے، غور وفکر کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ روز وشب کی گردش، شمس وقمر کے بدلتے مقامات اور ان کا گہن اور اپنے اپنے مدار میں ان کا مستقل محوِ سفر رہنا انسانی ذہن کو خدا کی وحدانیت، اس کی عظمت، حکمت اور جلال و جبروت کا احساس دلاتا ہے۔

ظہور اسلام کے بعد جو لوگ تسخیر و اکتشاف کی ایک نئی دنیا کے قیام کے لیے سرگرداں رہے وہ سب کے سب اس احساس سے سرشار تھے کہ وہ دراصل ایک مذہبی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو باقاعدہ مذہبی عہدوں پر فائز تھے اور معاشرے میں تقویٰ شعاری کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ یہ صورت حال آخر آخر تک قائم رہی۔ مثال کے طور پر ابن نفیس (متوفی ۱۲۸۸ء) جس نے ابن سینا کے 'القانون فی الطب' کا تنقیدی محاکمہ لکھا اور جس کے دورانِ خون کی بعض دریافتوں نے دنیائے طب کو انقلاب انگیز تبدیلی سے دو چار کیا، وہ فقۂ شافعی کے اساطین میں سے تھے۔ اسی طرح نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) جن کا Tusi Couple (الصغیرہ والکبیرہ) بطلیموسی نظریات کے رد میں سنگ میل سمجھا جاتا ہے اور جس نے آنے والے دنوں میں ایک متبادل نظام کائنات کے تخیل کا راستہ ہموار کیا، ان کا شمار اپنے عہد کے کبار اسمٰعیلی علماء میں ہوتا تھا۔ یہی حال ان کے شاگرد رشید قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) کا ہے، جو مراغہ کی رصدگاہ سے وابستہ رہے، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ طوسی کے تذکرہ پر شرحیں لکھیں بلکہ اس فن پر بعض طبع زاد کتابوں کا اضافہ بھی کیا۔ شیرازی ان تمام تر علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مقامی عدالتوں میں قاضی کے منصب پر بھی فائز رہے۔

یہاں تک کہ ان کے قلم سے 'جامع اصول الحدیث'، 'شرح السنۃ' اور 'فتح المنان فی تفسیر القرآن' جیسی وقیع کتابیں بھی نکلیں۔ نظام الدین نیشا پوری (متوفی ۱۳۲۸ء) جو اپنی سائنسی تالیف 'شرح التذکرہ' اور 'شرح المجسطی' کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں وہ بیک وقت 'غرائب القرآن و رغائب الفرقان' کے مصنف بھی ہیں۔ ابن شاطر جن کی تحریروں سے مغرب میں نئے نظام کائنات کی بحث شروع ہوئی اور جس کے سرقے سے کوپرنکس کو مغرب میں جدید دنیا کا بانی مبانی سمجھا گیا ان کی بابت تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ دمشق کی مسجد اموی میں موقیت کے عہدے پر مامور تھے۔ حتی کہ وہ لوگ بھی جن کے التباس فکری اور آزاد خیالی کا چرچا ہوتا رہا ہے جس میں ابن رشد کا نام سرفہرست ہے وہ بھی اشبیلیہ اور قرطبہ میں عہدۂ قضاۃ سے وابستہ تھے۔ گویا ظہور اسلام سے سولہویں صدی عیسوی تک تحریک تسخیر و اکتشاف بنیادی طور پر ایک مذہبی تحریک تھی جس کی کمان اہل مذہب کے ہاتھوں میں تھی۔ اپنے تمام تر التباس فکری کے باوجود جس سے مسلم فکر کے دھارے ابتدائی صدیوں میں مختلف سمتوں میں بہنے لگے تھے اکتشافی علوم کی دینی حیثیت مشکوک نہیں ہوئی تھی۔ البتہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلب و نظر میں کسی نامحسوس، تقلیب انگیز تبدیلی کے لیے فضا

ہموار ہو رہی ہو۔ ان عوامل کا تفصیلی محاکمہ تو ہم آئندہ کبھی کریں گے البتہ یہاں چند ضروری اشارات پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔

عبدالملک کی سیاسی اصلاحات

عبدالملک کے عہد میں جب اسلامی ریاست عرب امپائر کی صورت میں متشکل ہو رہی تھی بعض ایسے واقعات پیش آئے جس نے آنے والے دنوں میں ہمارے تہذیبی سفر پر فکری التباسات کی ایک دھند قائم کردی۔ عبدالملک خود اپنے عہد میں گوکہ نزاعی حکمراں رہے اور ایک طویل عرصہ تک سرزمین حجاز میں ان کی حکمرانی قائم نہ ہوسکی جہاں ابن زبیر منصب خلافت پر متمکن تھے۔ لیکن بعد کے دنوں میں تاریخ کتابوں میں انہیں قبولیت عامہ مل گئی۔ عبدالملک نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے جو مختلف اقدامات کیے ان میں ایک اہم قدم یہ تھا کہ انہوں نے پہلی بار اپنے انتظامی دفاتر اور حساب کتاب کے گوشواروں کو عربی میں منتقل کرنے کے احکامات صادر کیے۔ اس طرح گویا آنے والے دنوں میں عرب بیوروکریسی کی راہ ہموار ہوئی۔ اس عہد میں ایک دوسرا بڑا واقعہ یہ ہوا کہ بازنطینی حکمراں جسٹینین ثانی، جو تثلیث کا پرزور مبلغ تھا اور جسے یہ بات گراں گزرتی تھی کہ مسلم ریاست اپنے سرکاری خطوط کی پیشانی پر قل ھو اللہ لکھے اس نے عبدالملک کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنے مؤقف پر اصرار جاری رکھا تو وہ سکوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے میں ایسے الفاظ کندہ کرادے گا جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔

کہا جاتا ہے کہ عہد عبدالملک تک سونے اور چاندی کے سکے یا تو بازنطینی ٹکسال کے ڈھلے ہوتے تھے یا پھر ساسانی ریاست کی باقیات کے طور پر ان کی تصدیق شدہ مہروں کے سبب معتبر سمجھے جاتے تھے۔ روزمرہ کا لین دین ان ہی سکوں کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ بازنطینی دھمکی نے عبدالملک کو فوری اقدام پر آمادہ کیا اور یہ بات طے پائی کہ مسلم ریاست اب اپنی ٹکسال کا اہتمام خود کرے گی۔ عربوں کے لیے یہ میدان خاصا نیا تھا۔ خالد بن یزید جو الکیمی سے دلچسپی کے لیے معروف تھے، مشاورت کے لیے طلب کیے گئے اور پھر اس فن پر باقاعدہ مہارت کے لیے جدوجہد شروع ہوگئی۔ یہ دو عوامل ایسے تھے جنہوں نے اجنبی مآخذ سے فنی کتب کے ترجموں کی راہ ہموار کردی (جاری ہے)۔

مدیر کے نام

محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مندرجہ ذیل رپورٹیں اس عریضہ کے ساتھ ارسال خدمت ہیں:

- ۲۴ ستمبر کو لاہور میں منعقد ہونے والی ملی مجلس شرعی کی ''اتحاد امت کانفرنس''
- ۵ اکتوبر کو لاہور میں جمعیت علماء پاکستان (نورانی گروپ) کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی ''آل پارٹیز تحفظ ناموسِ رسالتؐ کانفرنس'' اور
- پاکستان شریعت کونسل کے ایک اہم مشاورتی اجلاس کی رپورٹ

آنجناب سے استدعا ہے کہ ازراہِ کرم ان کا بغور مطالعہ فرما کر اس سلسلہ میں اپنی گراں قدر رائے سے مستفید فرمائیں اور خاص طور پر اس حوالہ سے ہماری راہ نمائی فرمائیں کہ ان دینی وقومی معاملات میں مزید پیش رفت کے لیے ہمیں عملی طور پر اب اور کیا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے آنجناب کی سرپرستی ہمیں کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

امید ہے کہ آپ اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے اس کارِ خیر کے لیے کچھ وقت ضرور نکال سکیں گے۔

(مولانا) ابوعمار زاہد الراشدی
سیکرٹری جنرل پاکستان شریعت کونسل
سینئر نائب صدر ملی مجلس شرعی پاکستان

گرامی قدر مولانا زاہد الراشدی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جناب کا گرامی نامہ ملا۔ خط کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پاکستان کے دینی

مستقبل کے حوالے سے سوچنے والے دیگر احباب کو بھی یہ خط بھیجا ہے۔ اگر آپ کو کچھ جوابات موصول ہوئے ہوں تو از راہ کرم ان سے مجھے بھی آگاہ فرمائیں۔ اس بارے میں میری طالبعلمانہ گزارشات درج ذیل ہیں:

☆ پاکستان میں شریعت نافذ ہونی چاہیے اور اس کے احکام پر عمل ہونا چاہیے۔ اس بات پر سوائے کچھ سیکولر لوگوں کے، علماء کرام اور مسلمان عامۃ الناس متفق ہیں۔ گو شریعت پر عمل کے حوالے سے ان کے اندر کوتاہیاں موجود ہیں۔ جہاں تک ہمارے حکمرانوں کا تعلق ہے تو وہ اسلام دشمن عالمی طاقتوں کے دباؤ، ذاتی مفادات اور بعض ذہنی تحفظات کے وجہ سے ملک میں شریعت نافذ نہیں کرتے۔

☆ لیکن نفاذ شریعت کا مفہوم کیا ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟ اور یہ کس کی ذمہ داری ہے؟ اس والے سے ہمارے ہاں خاصا کنفیوژن موجود ہے جسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں اس کا یہ مفہوم ناقص ہے کہ پاکستان میں نفاذ شریعت صرف حکومت کی ذمہ داری ہے اور دینی عناصر کو حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ ملک میں شریعت نافذ کرے اور اس ضمن میں ضروری قانون سازی کرے —— اور بس۔ میرے خیال میں اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ احکام شریعت پر عمل کرنا ہم سب (عوام، علماء، حکام) کی ذمہ داری ہے اور سب کو اس میں اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور موجودہ حالات کی اصلاح کر کے ایسا ماحول اور حالات پیدا کرنے چاہئیں جن میں ہم سب احکامشریعت پر عمل کر سکیں۔ گویا اس کام کے عملاً تین فریق ہیں:

۱۔ عامۃ الناس: جن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی میں احکام شریعت پر عمل کریں [اور ان میں سے جو علم وعمل کی اچھی صلاحیت رکھتے ہوں وہ دوسروں کو بھی توجہ دلائیں]۔

۲۔ علماء کرام: جن کا کام یہ ہے کہ وہ خود دین پر عمل کرنے کے ساتھ عوام کو بھی اسلامی احکام پر عمل کی ترغیب دیں اور حکمرانوں کو بھی اس فریضے کی طرف توجہ دلائیں۔

۳۔ حکمران: جن کا کام یہ ہے کہ وہ ذاتی زندگی میں دین پر عمل کرنے کے ساتھ ریاستی قوت اور ذرائع سے ملک میں شریعت نافذ کریں اور معاشرے اور ریاست میں ایسا ماحول پیدا کریں جس میں احکام شریعت پر عمل آسان ہو جائے۔

اِس وقت تک اِن مذکورہ تینوں فریقوں نے نفاذ شریعت کا کام جس طرح کیا ہے اور جو نتائج ان کے کام کے نکلے ہیں وہ غیر تسلی بخش ہیں، نظر ثانی کے محتاج ہیں اور اس کام کے لیے نئی حکمت عملی اور کام کے نئے اسالیب وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

کام کی نئی حکمت عملی اور نئے اسالیب کیا ہو سکتے ہیں؟ اس ضمن میں میری تجویز یہ ہے کہ کام کو

سماجی اور سیاسی دو شعبوں میں تقسیم کر دینا چاہیے اور ان میں کام کی ترتیب یہ ہونی چاہیے:

سماجی شعبہ: فریق اول یعنی عامۃ الناس یا سوسائٹی کے اہم طبقات (مثلاً دانشور، ادیب، صحافی، پروفیسرز، اساتذہ، طلبہ، ڈاکٹرز، انجینئرز، تاجر، صنعتکار۔۔۔وغیرہ) کے دین دار عناصر اور فریق دوم یعنی علماء کرام مل کر منظم و متحد ہو جائیں اور مقاصد شریعت کے حصول کے لیے حکومت پر انحصار کرنے کی بجائے آئین و قانون جس حد تک اجازت دیتا ہے خود ادارے بنا کر شریعت پر عمل درآمد شروع کر دیں۔ اس طرح تعلیم، میڈیا، تعمیر اخلاق، معیشت، معاشرت، انصاف، امن و امان کے شعبوں میں اتنا کام کیا جا سکتا ہے کہ آج حکومت سے نفاذ شریعت کے لیے جن امور کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس کا ۷۰، ۸۰ فیصد کام پرائیویٹ سیکٹر میں ہو سکتا ہے۔

سیاسی شعبہ: نفاذ شریعت کے لیے ریاستی قوت اور وسائل کیسے استعمال کیے جائیں؟ اس کے لیے جن نئے طریقوں سے کام کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں:

ا۔ موجودہ دینی سیاسی جماعتوں کو نفاذ شریعت اور دینی تناظر میں سیاسی حکمت عملی کے متفقہ نکات پر متحد کرنے کی کوشش کی جائے۔

ب۔ ان سے مل کر نفاذ شریعت کے لیے ہوم ورک کیا جائے تا کہ اگر انہیں اقتدار ملے تو وہ نفاذ شریعت کے حوالے سے مؤثر نتائج دے سکیں اور حزب اختلاف میں ہوں تو بھی نفاذ شریعت کے لیے متفقہ حکمت عملی سے حکومت سے کام کروا سکیں۔ اس کے لیے قانون سازی پر اصرار کی بجائے سماجی شعبے کی اصلاح کو ترجیح دی جائے۔

ج۔ جزو ا اور ب میں مذکور یہ کام فریق اوّل و دوم پر مشتمل وہ متحدہ تنظیم کرے جس کا ذکر اوپر سماجی شعبہ میں ہوا۔ جب یہ طے، واضح، نمایاں اور عملاً ثابت ہو جائے اور لوگوں کو یہ یقین آ جائے کہ یہ تنظیم سیاست میں حصہ نہیں لے گی، الیکشن نہیں لڑے گی اور اقتدار کی دوڑ میں شامل نہیں ہو گی تو اس کے لیے یہ بھی ممکن ہو گا کہ وہ پاکستان کی دوسری (سیکولر) سیاسی جماعتوں کے افراد کی دینی تناظر میں اصلاح کر سکے یا نفاذ شریعت کے کسی مسئلے پر ان پر اخلاقی دباؤ ڈال سکے، بلکہ بالواسطہ طور پر دینی سیاسی جماعتوں کی اصلاح کے لیے بھی کام کر سکے۔

یہ خط میں ذاتی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ ملی مجلس شرعی کے احباب اس پر غور کر سکتے ہیں کہ آیا مجلس کو اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کرنا چاہیے یا نہیں؟

محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات